ڈاکٹر عبادت بریلوی

بلاکشانِ محبّت

اِدارۂ ادب و تنقید لاہور

ڈاکٹر عبادت بریلوی

اِدارۂ ادب و تنقید ○ لاہور

تصنیف : بلاکشانِ محبت
مُصنّف : پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی
ناشر : فریدالدین، ناظم ادارۂ ادب و تنقید لاہور
سرورق : سیّد انور حسین شاہ نفیس رقم لاہور
کتابت : سیّد محمد ابراہیم خوشنویس
مطبع : ندیم یونس پرنٹرز لاہور
اہتمام : سیّد محمد ابراہیم جامعہ اشرفیہ لاہور
جلد سازی : مدنی بک بائینڈنگ ہاؤس لاہور
تعاون : اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد
تاریخ اشاعت : اگست ۱۹۸۹ء
قیمت : ساٹھ روپے

مادرِ علمی

پنجاب یونیورسٹی، لاہور

کی

یاد میں

جہاں میں نے بہ حیثیت یونیورسٹی پروفیسر، صدر شعبۂ اُردو، پرنسپل اورینٹل کالج، ڈین فیکلٹی آف اورینٹل اینڈ اسلامک لرننگ اور ڈائرکٹر شعبۂ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، عمرِ عزیز کے تقریباً اکتیس ۳۱ سال گذارے، اور جس کی آغوش میں میرے بیشتر علمی ادبی کام کی نشو و نما ہوئی۔

عبادت بریلوی

عَلی الصَبح چُو مُردم بہ کاروبار رَوند
بَلاکشانِ محبت بہ کوئے یار روند

——— حافظ

فہرست

پیش لفظ ۷

۱

۱۔ مولانا صلاح الدین احمدؔ ۹
۲۔ مُصوّرِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی ۲۳
۳۔ میاں ام۔ اسلم ۴۱
۴۔ پروفیسر عزیز احمدؔ ۵۱
۵۔ حبیب جالب ۶۹

۲

۶۔ پروفیسر سراج الدین ۷۵
۷۔ ڈاکٹر نذیر احمدؔ ۹۱
۸۔ پروفیسر خواجہ صلاح الدین ۱۰۳

۳

۹۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی ۱۱۳
۱۰۔ مولانا سید مرتضیٰ حسین فاضل ۱۲۵

پیش لفظ

گذشتہ کئی سال سے میں اس دور کی اہم شخصیات پر کام کر رہا ہوں۔ اب تک ان شخصیات سے متعلق خاکوں کے جو مجموعے شائع ہوئے ہیں، اُن میں رہ نوردانِ شوق، آوارگانِ عشق، جلوہ ہائے صد رنگ اور یارانِ دیرینہ، قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بلاکشانِ محبت، غزالانِ رعنا، شجرہ ہائے سایہ دار، محبانِ بادہ پیما اور خوش نوایانِ چمن طباعت و اشاعت کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔

اب تک جن اہم شخصیات پر کام ہو چکا ہے، اُن میں بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مولانا حسرت موہانی، حضرت جگر مُرادآبادی، حضرت مولانا ابوالکلام آزاد، شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی، علامہ نیاز فتح پوری، پروفیسر صوفی تبسم، پروفیسر حمید احمد خاں، فیض صاحب، مجاز، میراجی، بلونت سنگھ، پروفیسر محمد حسن عسکری، میاں بشیر احمد، جناب حفیظ جالندھری، ڈاکٹر برکت علی قریشی، ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر سید وقار عظیم، پروفیسر سید وزیر الحسن عابدی، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، مولانا نور الحسن خاں اور ڈاکٹر صابر علی خاں کے نام سرِ فہرست ہیں۔

اس وقت خاکوں کا جو نیا مجموعہ بلاکشانِ محبت، کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے، اُس میں مولانا صلاح الدین احمد، مصورِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی، میاں ایم اسلم،

پروفیسر عزیز احمد، حبیب جالب، پروفیسر سراج الدین، ڈاکٹر نذیر احمد، پروفیسر خواجہ صلاح الدین، مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور مولانا سید مرتضیٰ حسین فاضل کی شخصیتوں کے خاکے ہیں۔

یہ خاکے اس اعتبار سے توجہ کے طالب ہیں کہ ان میں جو مواد پیش کیا گیا ہے وہ بالکل اچھوتا اور نیا ہے۔ اور ان میں نہ صرف ان شخصیات کی چلتی پھرتی تصویریں نظر آتی ہیں بلکہ بیسویں صدی کے اس عظیم دور کے سیاسی، معاشرتی، تہذیبی، علمی، تعلیمی ادبی، شعری اور فنی ماحول کے ان گنت مناظر بھی آنکھوں کے سامنے بے نقاب ہوجاتے ہیں۔

اس طرح ان خاکوں کی بدولت اسلامیان پاکستان و ہند کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے نشیب و فراز اور اُن کے مختلف پہلوؤں سے آشنا ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اور یہی اِن کی ترتیب و تالیف اور طباعت و اشاعت کا مقصد ہے!

عبادت بریلوی

لاہور
۲۵ر جولائی ۱۹۸۹ء

مولانا صلاح الدین احمدؒ

مولانا صلاح الدین احمدؒ سے میرا غائبانہ تعارف ان کے رسالے اُدبی دنیا۔ کے ذریعے ہوا۔

اُدبی دُنیا اُس زمانے میں بڑے سائز پر چھپتا تھا۔ اور نئے لکھنے والوں کی نظمیں، مضامین، اور افسانے اُس میں ہر مہینے نہایت اہتمام سے شائع ہوتے تھے۔ اس ادبی رسالے کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ مولانا اڈیٹر کی حیثیت سے، نئے لکھنے والوں کی تحریروں پر اپنے ادارتی صفحات میں بڑی خیال انگیز تنقیدی باتیں کرتے تھے۔ اس لئے ہر نئے لکھنے والے کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ اس کی تحریریں "ادبی دُنیا" میں چھپ جائیں اور مولانا اپنے قلم سے دو چار سطریں اُس کے بارے میں لکھ بھی دیں۔

میں اُن دنوں لکھنؤ یونیورسٹی میں بی۔ اے کا طالب علم تھا۔ ادب سے مجھے دلچسپی تھی۔ لکھنے کا بھی شوق تھا۔ ادبِ لطیف، ہمایوں، ساقی، زمانہ، شاہکار، عالمگیر اور نگار میں میرے کچھ مضامین شائع بھی ہوئے تھے۔ مشہور نقاد اور ادیب پروفیسر سید احتشام حسین صاحب ہمارے اُستاد تھے۔ اُنھوں نے مجھے ادب کے راستے پر ڈال دیا تھا۔ اُن کے پاس اُدبی دنیا، باقاعدگی سے ہر مہینے آتا تھا، اور اس میں اُن کے مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ اس طرح ہر مہینے غائبانہ طور پر مولانا صلاح سے ہماری مُلاقات ہو جاتی تھی اور اُن کے ادارتی شذرات کو پڑھ کر جی خوش ہوتا تھا۔ میں اور ادب سے دلچسپی لینے والے میرے ساتھی مولانا کی تنقیدی بصیرت اور

اُن کی شگفتہ و شاداب اندازِ نگارش کے دلدادہ تھے۔ لیکن میں اُن سے ڈرتا تھا۔ احتشام صاحب کے کہنے کے باوجود کوئی چیز مولانا کو ادبی دُنیا میں اشاعت کے لئے بھیجنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔

سُنا یہ تھا کہ مولانا کے پاس ادبی دُنیا میں اشاعت کے لئے اتنی بڑی تعداد میں مضامین آتے کہ وہ ان کو بوروں میں رکھنے کے لئے مجبور ہو جاتے۔ جب ضرورت ہوتی تھی، ان بوروں میں سے کچھ مضامین نکالتے تھے اور جو انہیں معیاری معلوم ہوتے تھے، انہیں ادبی دُنیا میں شائع کر دیتے تھے۔

خدا جانے یہ بات کہاں تک صحیح تھی لیکن لکھنؤ کے ادبی حلقوں میں اس قسم کی باتیں مزے لے لے کر بیان کی جاتی تھیں۔ ایسے لوگ اس قسم کی باتیں زیادہ کرتے تھے جنہوں نے ادب کی دُنیا میں نیا نیا قدم رکھا تھا، اور جن کی یہ خواہش تھی کہ اُن کی تحریریں ادبی دُنیا میں چھپ کر سامنے آئیں۔ ان باتوں میں کچھ تو افسانہ تھا اور کچھ حقیقت!

یہ بات بھی مشہور تھی کہ مولانا نے ادیبوں کے خطوں کے جواب نہیں دیتے۔ کوئی مضمون چھپنے کے لئے بھیجے تو اس کو رسید کی اطلاع نہیں ملتی۔ اور یہ خیال بھی عام تھا کہ بیشتر نوجوان لکھنے والوں کے مضامین ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیئے جاتے ہیں۔

اسی زمانے میں یونیورسٹی کے ایک انڈر گریجویٹ طالب علم کے ساتھ ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ اس طالب علم کو ادب کا چسکا تھا۔ وہ نئے انداز کی شاعری کرتا تھا، اور اپنی نظمیں رسالوں میں اشاعت کے لئے بھیجتا تھا۔ کچھ چھپ جاتی تھیں، کچھ ردّی کی ٹوکری میں پہنچ جاتی تھیں۔ ادبی دُنیا میں اس کو اپنی نظمیں چھپوانے کا بڑا ارمان تھا۔ اُس نے ایک نظم مولانا صلاح الدین ایڈیٹر ادبی دُنیا کے نام ایک خط کے ساتھ بھیجی۔ جواب نہیں آیا۔ کئی مہینے بعد اُس نے وہی نظم ایک خاتون کے نام سے ادبی دُنیا کے ایڈیٹر کو بھیج دی۔ فوراً مولانا کا جواب آیا، جس میں یہ لکھا تھا کہ آپ کی نظم بہت خوب ہے۔ آئندہ شمارے میں اس کو شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ نظم ثریا جبیں کے نام سے ادبی دُنیا کے تازہ شمارے میں شائع ہو گئی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ مولانا خواتین کی ہمت افزائی کرتے تھے، اور اُن کی یہ خواہش تھی کہ لڑکیاں

خاص طور پر ادب و شعر کی طرف متوجہ ہوں، اور گھروں میں ادب و شعر کا ماحول پیدا ہو۔

مولانا ایک اڈیٹر کی حیثیت سے جوہر قابل کی تلاش میں رہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، بلونت سنگھ، میراجی، مختار صدیقی، قیوم نظر، یوسف ظفر، حفیظ ہوشیارپوری، اور ایسے ہی بہت سے نئے لکھنے والوں کو تلاش کیا، اور اپنے دو چار تنقیدی نشتروں سے انہیں شہرت کے آسمان پر پہنچا دیا۔ وہ معیار کے معاملے میں سخت ضرور تھے لیکن نئے ادیبوں کی ہمیشہ ہمت افزائی کرتے تھے، اور اُن کے اس رویّے نے سارے ہندوستان کے اُردو داں گھرانوں میں خاصا ادبی ماحول پیدا کر دیا تھا۔

میں نے اپنے اُستاد پروفیسر سیّد احتشام حسین صاحب کے توجہ دلانے کے باوجود اُس زمانے میں اپنا کوئی مضمون 'ادبی دنیا' میں شائع ہونے کے لئے نہیں بھیجا۔ لیکن عجیب اتفاق ہوا کہ مولانا نے اس زمانے میں میرے دو مضامین جو دوسرے رسالوں میں شائع ہوئے تھے، اُن کو 'ادبی دُنیا' میں جگہ دی۔ ایک مضمون تو اُردو ادب میں طنز و مزاح کے موضوع پر تھا جو رسالہ ساقی میں شائع ہوا تھا۔ اور دوسرا نذیر احمد کی ناول [illegible]ری کے بارے میں تھا جو لاہور کے کسی رسالے میں شائع ہوا تھا۔ مولانا نے اس زمانے میں معاصر رسالوں میں شائع ہونے والے بعض منتخب مضامین کو 'ادبی دُنیا' کے صفحات میں شائع کرنا شروع کیا تھا۔ ان مضامین پر مولانا اپنے مخصوص انداز میں چند تنقیدی فقرے بھی لکھے تھے۔ حالانکہ ان مضامین میں، میرے خیال کے مطابق کوئی خاص بات نہیں تھی۔ یہ میری ابتدائی کوششیں تھیں۔ لیکن مولانا نے ان کو پسند کیا۔ اپنے رسالے میں جگہ دی، اور خط لکھ کر اور رسالہ میرے نام جاری کر کے بھی میری ہمت افزائی کی، اور اس طرح مجھے نئے لکھنے والوں کی صف میں شامل کر دیا۔

یہ مولانا سے میری غائبانہ تقریب بہرملاقات تھی۔ اس کے بعد اُن سے میری خط و کتابت رہی، اور میں نے کچھ مضامین بھی وقتاً فوقتاً 'ادبی دُنیا' میں لکھے جن کو پسند کیا گیا۔

مولانا صلاح الدین احمد طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے رومانی اور جمال پرست تھے۔ اُن کے اس مزاج نے رسالہ 'ادبی دُنیا' کو معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے ایک حسین و جمیل رسالہ بنا دیا تھا۔ اُس وقت یہ رسالہ بڑے سائز پر نکلتا تھا۔ اس میں زیادہ تر رومانی

انداز کی نظمیں، غزلیں، افسانے اور مضامین شائع ہوتے تھے۔ مولانا کے اپنے مضامین اور ادارتی شذرات بھی اُن کے اس رومانی انداز تحریر کے شاہکار ہوتے تھے، اور اس اعتبار سے ان کا رسالہ "ادبی دُنیا" اس زمانے کے اُردو رسالوں میں ایک منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ لوگ اس کو دیکھ کر اور پڑھ کر خوش ہوتے تھے۔

مولانا سے میری پہلی مُلاقات قیام پاکستان کے بعد لاہور میں ہوئی جب میں دلی میں لُٹ پِٹ کر لاہور آیا، اور یہاں کے ادبی ماحول میں گھُل مِل گیا۔ غائبانہ طور پر تو اس سے قبل بھی لاہور کے ادیبوں، رسالوں کے اڈیٹروں اور اہم ناشروں سے تعارف تھا۔ لیکن لاہور آ کر ان سب سے بالمشافہ ملنے اور اُن کو قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے۔

اِن میں بلاشبہ سب سے اہم شخصیت مولانا صلاح الدین احمد کی تھی۔ وہ اُس زمانے میں انارکلی کے قریب رہتے تھے۔ قیام پاکستان کے وقت جو فسادات ہوئے اُن میں اُن کا کتب خانہ بھی جلا دیا گیا تھا۔ مجھے اس کی خبر پہلے ہی مل چکی تھی، اور یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ مولانا کی طبیعت پر اس کا بہت اثر ہے، اور وہ اس واقعے کی وجہ سے اُداس رہتے ہیں۔

میری مُلاقات اُن سے ڈرامائی انداز میں ہوئی۔

میں اُن دنوں مال روڈ پر ریگل کے قریب اپنے ایک عزیز کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ اورنٹیل کالج میں اُن دنوں میرا لیکچر صبح کو آٹھ بجے ہوا کرتا تھا۔ میں صبح کو ریگل سے پیدل چل کر نیلا گنبد ہوتا ہوا انارکلی کے چوراہے کو پار کر کے اورنٹیل کالج پہنچتا تھا۔ کئی مہینے میرا یہ معمول رہا۔

ایک دن میں انارکلی کے چوراہے پر پہنچا تو دیکھا سامنے سے ایک صاحب سر سے پاؤں تک ایک سیاہ رنگ کے کمبل میں لپٹے ہوئے مدینہ بکری کی طرف جا رہے ہیں۔ سردی شدید تھی۔ اس لئے اُنھوں نے یہ کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ لیکن اس میں سے اُن کا وجیہ چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس سے قبل اُن سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ صرف اُن کی تصویریں میں نے دیکھی تھی۔ پہلے تو مجھے یقین نہیں آیا کہ یہ مولانا صلاح الدین ہیں، لیکن جب مدینہ بکری کے سامنے کھڑے ہوئے ایک صاحب نے مولانا صلاح الدین صاحب کہہ کر انہیں مخاطب کیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے غلطی نہیں کی ہے۔ یہ مولانا ہی ہیں۔

لیکچر میں ابھی کوئی آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ اس لئے میں اُن کے پیچھے پیچھے مدینہ بکری میں چلا گیا۔ مولانا سے اجازت لے کر اُن کے قریب کی نشست پر بیٹھا۔ اپنا تعارف کروایا۔ مولانا مل کر بہت خوش ہوئے۔ گلے لگایا۔ اپنے قریب بٹھایا۔ حال احوال پوچھا۔ اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔

کہنے لگے "آپ کے آنے کی خبریں تو مشہور ہو رہی تھیں یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ اورینٹل کالج نے آپ کو تار بھیج کر بلا یا ہے لیکن مجھے اس کا علم نہیں تھا کہ آپ لاہور آگئے ہیں۔ خیر بہت اچھا ہوا کہ آپ آگئے۔ یہاں آپ کی ضرورت تھی۔ اب طوفان گذر چکا ہے۔ حالات نسبتاً بہتر ہیں۔ بظاہر امن ہو گیا ہے۔ لیکن ابھی تک انتشار بہت ہے۔ جیسے جیسے وقت گذرے گا حالات معمول پر آتے جائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اس شہر میں آپ کا دل لگ جائے گا اور آپ یہاں اجنبیت محسوس نہیں کریں گے۔"

میں نے کہا "یہ تو ادیبوں کا شہر ہے۔ دانشوروں کا شہر ہے، دل والوں کا شہر ہے۔ خوبصورت لوگوں کا شہر ہے۔ یہ تو شہر غزال چشماں اور دیار سمن عذاراں ہے۔ یہاں کس کا دل نہیں لگے گا؟

یہاں آنے کی تو برسوں سے آرزو تھی شکر ہے کہ یہ آرزو پوری ہوئی۔"

مولانا میری گفتگو کے اس رومانی انداز سے بہت محظوظ ہوئے۔ شاید اس لئے کہ اس میں اُن کے مخصوص انداز گفتگو اور طرز نگارش کی جھلک تھی، اور جو میں نے اس خیال سے جان کر مولانا کے سامنے کی تھی کہ وہ اس سے محظوظ ہوں گے۔ میرا تیر نشانے پر لگا، اور مولانا نے میری گفتگو کے اس جذباتی اور رومانی رنگ و آہنگ کی بہت داد دی۔ چائے منگوائی۔ اصرار کر کے پلائی، اور دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے۔

آدھ گھنٹے تک اُن سے باتیں کر کے میں اورینٹل کالج پہنچا۔ لیکچر دیا، اور احباب کو مولانا سے ڈرامائی انداز میں ہونے والی اس ملاقات کی روداد سنائی جس سے سب محظوظ ہوئے۔

اس زمانے کا اورینٹل کالج آج کل کے اورینٹل کالج سے مختلف تھا۔ اس زمانے میں وقار عظیم صاحب اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب یہاں آگئے تھے۔ ڈاکٹر عبداللہ وہاں

پہلے سے موجود تھے۔ میں بھی آگیا تھا۔ ہم سب نے مل کر اس ادارے کو ایک ادبی مرکز کی حیثیت دے دی تھی۔ ادیبوں کا وہاں ہنگامہ رہتا تھا۔ جلسے ہوتے تھے، مشاعرے ہوتے تھے۔ نئے ادب کے علم بردار وہاں جمع ہوتے تھے۔ مقالے پڑھے جاتے تھے۔ افسانے سُنائے جاتے تھے۔ نظمیں اور غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ بڑی بڑی کانفرنسیں ہوتی تھیں جس میں ادیب، مفکر اور دانشور شرکت کرتے تھے۔ شاید ہی اُس وقت کا کوئی ادیب اور شاعر ایسا ہو جس نے اس زمانے میں اورینٹل کالج کو نہ نوازا ہو۔

مولانا صلاح الدین احمدؒ کو بھی ہم لوگ اکثر زحمت دیتے تھے، اور وہ ہمیشہ ہماری دعوت پر اورینٹل کالج آجاتے تھے۔ ہمیشہ مقالہ لکھ کر لاتے تھے، اور اپنے مخصوص انداز میں گل افشانیاں کرتے تھے۔ سماں بندھ جاتا تھا۔ لوگ بڑے ذوق و شوق سے اُن کے مقالے سُنتے تھے، اور داد دیتے تھے۔ اُردو زبان، علامہ اقبال، اور اُردو افسانہ اور ناول اُن کی دلچسپی کے موضوعات تھے اور اِن موضوعات پر اپنے بیشتر مقالے انہوں نے اورینٹل کالج کی ادبی تقریبات ہی میں پڑھے تھے اور اس طرح اُن کی ادبی و تنقیدی نگارشات کا خاصا سرمایہ جمع ہوگیا تھا۔

میں نے اِن تحریروں کی اہمیت کو محسوس کرکے مولانا سے کئی بار انہیں یکجا کرکے کتابی صورت میں شائع کرنے کی درخواست کی۔ لیکن مولانا شہرت کے خیال سے بے نیاز تھے۔ اس لئے اس کام کی طرف انہوں نے خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔ دوسرے ادیبوں کی پرانی اور نئی کتابیں چھاپتے رہے، اپنی کتاب نہیں چھاپی۔ میرے بار بار توجہ دلانے پر ایک خط میں مجھے لکھا۔

ادبی دُنیا منزل لاہور
۲۶ مئی ۵۸ء

محترمی و مکرمی جناب ڈاکٹر صاحب۔ السلام علیکم

والا نامہ ابھی ابھی ملا۔ یاد فرمائی اور حوصلہ افزائی کے لئے سراپا سپاس ہوں۔
یہ دراصل آپ ہی کا حُسنِ نظر ہے ورنہ میں کس قابل ہوں!
میری منتشر خرفات اِدھر اُدھر بکھری پڑی ہیں، اور ہمیشہ فرمائشاً لکھی گئی

ہیں۔ اس لئے اُن کی قدر وقیمت نہیں ہے۔

وزیر آغا صاحب کی کتاب جلد بندی کا مرحلہ طے کر رہی ہے انشاءاللہ چند روز میں اس کا ایک نسخہ ارسالِ خدمت والا ہوگا۔

والسلام

مخلص صلاح الدین احمدؒ

یہ باتیں بہ حیثیت ایک ادیب اور نقاد اُن کی شخصیت کی عظمت کو ظاہر کرتی ہیں۔ وہ واقعی ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بُنیادی طور پر ایک ادبی انسان تھے۔ ادب اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ انہوں نے زندگی بھر ادب کی آبیاری کی۔ اُردو زبان و ادب کے منت پذیر شانہ گیسوؤں کو سنوارا۔ نئے ادب کی کئی نسلوں کی ہمت افزائی کی اور ادب سے دلچسپی لینے کے لئے ایک سازگار ماحول پیدا کیا۔ وہ خود ایک صاحب طرز ادیب اور انشاء پرداز تھے۔ اُن کی تنقیدی بصیرت سے کسی کافر ہی کو انکار ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کلاسیکی اُردو ادب کے علم برداروں، اُردو کے نئے اور پرانے افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں اور علامہ اقبالؒ کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر ہزاروں صفحات لکھے۔ اُن کی تنقیدی تحریریں احباب کے اصرار پر کئی جلدوں میں مرتب ہوئیں۔ لیکن افسوس ہے کہ جب وہ چھپ کر کتابی صورت میں شائع ہوئیں تو مولانا اس دُنیا میں موجود نہیں تھے۔ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔

مولانا صلاح الدین احمدؒ ایک عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے۔ خوب رو، خوش شکل وجیہہ، دلکش، جاذب نظر، وضع دار، خلیق، مہذب، شائستہ، مخلص، ملنسار انسان دوست، صدق و صفا کے علم بردار، باقاعدگی کے پرستار، روشن خیال، حسن و جمال کے شیدائی دُھن کے پورے کام کے پکے۔۔۔ بس وہ ان تمام خوبیوں سے پہچانے جاتے تھے۔ انہیں ان تمام انسانی خصوصیات کا ایک حسین و دلآویز مجسمہ کہا جائے تو بے جا نہیں۔

گول چہرہ، بھرا بھرا جسم، کُشادہ پیشانی، کھُلتا ہوا گندمی رنگ، چہرے پر داڑھی کے بغیر درمیانی سائز کی مونچھیں، اور اس پر ہر وقت کھیلتی ہوئی ہلکی سی مُسکراہٹ۔۔۔ بس اس

صورت شکل سے مولانا پہچانے جاتے تھے۔ ہمیشہ کوٹ پتلون میں ملبوس، اور ہر موسم میں سر پر سولہ ہیٹ لگائے ہوئے مولانا مال روڈ پر پیدل چلتے ہوئے نظر آتے تھے۔ گھر سے دفتر اور دفتر سے ڈاک خانے تک پیدل جانا اُن کا معمول تھا۔ کسی قسم کی سواری اُن کے لئے بے معنی تھی۔

اُدبی دُنیا، اور اکادمی پنجاب کا دفتر ایک زمانے تک مال روڈ پر رتگل کے قریب ایک پُرانی عمارت میں رہا۔ مولانا گھر سے پیدل چل کر صبح کو دفتر آجاتے تھے، اور پھر شام تک وہیں رہتے تھے۔ اس دفتر میں اُدبی دُنیا مُرتب ہوتا تھا۔ اُردو کی ترویج کے لئے یہاں منصوبے بنائے جاتے تھے۔ اکادمی پنجاب کے زیرِاہتمام اُردو کی کتابوں کی ترتیب و تالیف اور طباعت و اشاعت کا کام بھی اسی دفتر میں ہوتا تھا۔ احباب بھی یہیں اُن سے ملنے آتے تھے۔ ادیبوں کا بھی یہاں جمگھٹا رہتا تھا۔

مولانا اس چھوٹے سے دفتر میں دن بھر مشغول رہتے تھے۔ ہر وقت یہاں کام ہوتا رہتا تھا لیکن جو بھی یہاں آتا مولانا اس سے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے تھے۔ یہاں چائے کا دور چلتا رہتا تھا۔ مولانا ہر آنے والے کے لئے چائے اپنے ہاتھ سے بناتے تھے، اور اصرار کر کے نہایت محبت سے پلاتے تھے۔ مولانا کا دسترخوان بہت وسیع تھا، اور وہ مہمانوں کی خاطر تواضع کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

اُن کے دفتر میں کوئی باقاعدگی نہیں تھی۔ ہر طرف کتابیں اور کاغذات بکھرے ہوئے نظر آتے تھے۔ صفائی بھی بس برائے نام ہی ہوتی تھی۔ اس لئے کہ مولانا کو اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ وہ خود جھاڑ پونچھ کریں یا کسی سے کروائیں۔ اس معاملے میں اُن کے مزاج میں ایک عجیب طرح کی درویشی تھی، اور واقعی وہ ہر لحاظ سے ایک درویش تھے۔

مولانا اس دفتر میں بیٹھ کر اُدبی دُنیا کو مُرتب کرتے تھے، اور یہ رسالہ ہمیشہ مہینے کی پہلی تاریخ کو باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو کر بازار میں آجاتا تھا۔ یہیں بیٹھ کر وہ اداریے بھی لکھتے تھے۔ مختلف محفلوں میں پڑھنے کے لئے مقالے بھی تحریر کرتے تھے۔ ریڈیو

کی اکثر یریں بھی یہیں لکھی جاتی تھیں۔ غرض مولانا اپنا سارا ادبی کام اپنے اسی دفتر میں کرتے تھے۔ دفتر میں باقاعدگی نہ ہونے کی وجہ سے مولانا کے بعض کاغذات ادھر اُدھر بھی ہو جاتے تھے۔ بعض اوقات ادبی دنیا میں شائع ہونے والے بعض مضامین گم ہو جاتے تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ مولانا نے مجھ سے ادبی دنیا کے لئے فرمائش کر کے مضامین لکھوائے لیکن اُن میں سے بعض ادھر اُدھر بھی ہوئے۔ بعض گم بھی ہوگئے لیکن پھر تلاش کے بعد مل بھی گئے۔ میرے مضامین جو رسائل میں چھپتے ہیں میں ہمیشہ ان کے مسودے واپس حاصل کر لیتا ہوں۔ میری اس عادت نے ایک دفعہ مولانا کو بہت پریشان کیا، اور مجھے ندامت ہوئی۔ مضمون گم ہوا تو مولانا نے مجھے لکھا:۔

"مکرمی جناب ڈاکٹر صاحب، السلام علیکم

مجھے بے حد ندامت ہے کہ آپ کا قیمتی مضمون کاتب سے کہیں گم ہو گیا ہے۔ بہرحال اس کی تلاش جاری ہے۔ ابھی مایوسی نہیں ہوئی۔ انشاءاللہ مل جائے گا اور ملتے ہی میں خود اُسے لے کر حاضر ہوں گا۔

والسلام

مخلص صلاح الدین احمدؔ

یہ مضمون تو ادبی دُنیا میں شائع ہو گیا، لیکن اُس کا مسودہ نہ مل سکا۔ مولانا سے جب بھی ملاقات ہوتی تھی وہ ہمیشہ معذرت کرتے تھے، اور مجھے ندامت ہوتی تھی، اور میں ہمیشہ یہ کہہ کر اُن کے اس احساسِ ندامت کو دور کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ "مولانا! مضمون تو شائع ہو گیا ہے، اب اس کے مسودے کی کیا ضرورت ہے" اس بات سے مولانا خوش ہو جاتے تھے، اور اُن کا بوجھ ہلکا ہو جاتا تھا۔

اگرچہ مولانا کے پاس ادبی دنیا کے لئے مضامین کی کمی نہیں ہوتی تھی کیونکہ بے شمار مضامین ان کے پاس آتے تھے، اور جیسا کہ میں نے پہلے کہا، وہ ان مضامین کو بوروں یا تھیلیوں میں محفوظ رکھتے تھے۔ لیکن اپنے مزاج کے مطابق مختلف لکھنے

والوں سے مضامین لکھواتے بھی تھے۔ اور اس کے لئے بار بار فرمائش کرتے تھے۔
فرمائش کا انداز یہ ہوتا تھا:۔

ادبی دُنیا

مال روڈ لاہور

۲۰ فروری ۱۹۶۰ء

مکرمی جناب ڈاکٹر صاحب، السلام علیکم

ادبی دُنیا کے گذشتہ شمارے میں آپ شامل ہوئے لیکن اسلوب شمولیت میرے لئے کچھ زیادہ تسلی کا موجب نہ ہوا۔ اب کے میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک بھرپور انداز میں شریک بزم ہوں۔ شمارۂ دوم یکم اپریل کو انشاءاللہ منظر عام پر آجائے گا۔ اس لئے مضمون اوائل مارچ میں ضرور موصول ہو جانا چاہئیے۔ یہ طے ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں فرمائیں گے۔

اُمید ہے کہ مزاج گرامی اعتدال پر ہوگا۔

والسلام

مخلص صلاح الدین احمدؒ

اس طرح آج کل کون مضمون لکھوائے گا؟ یہ سب کچھ تو مولانا صلاح الدین ہی کر سکتے تھے!

مولانا کو اُردو زبان اور ادب سے عشق تھا۔ اُنہوں نے اپنی زندگی اُردو زبان اور ادب کی خدمت میں گذار دی۔ وہ اُردو زبان کے بہت بڑے محسن تھے —— بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے ساتھ اُن کا نام بھی اس اعتبار سے ہماری تہذیب و ثقافت کے اُفق پر ایک درخشندہ ستارے کی طرح ہمیشہ ہمیشہ زندہ و تابندہ نظر آتا رہے گا۔

اُنہوں نے قیام پاکستان سے قبل ہی اُردو بولو اُردو لکھو، اُردو پڑھو، کی تحریک چلائی، اور اپنی تمام صلاحیتوں کو اس کام کے لئے وقف کر دیا۔ اس کا اثر نہ صرف

پنجاب بلکہ برِعظیم پاکستان و ہند کے مسلم گھرانوں کے لئے بہت اچھا ہوا۔ بلکہ ہندو اور سکھ تک اس تحریک سے متاثر ہوئے۔ جس وقت مولانا نے یہ تحریک چلائی ہے ہندوستان میں لوگ اپنی اپنی بولیاں بولتے تھے ـــــ اور انگریزی کا اثر تو اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ انگریزی میں بات کرنا، خط لکھنا، مضمون نگاری کرنا، اور انگریزی کتابوں اور رسالوں کا پڑھنا مہذب ہونے کی نشانی تصور کیا جاتا تھا۔ مولانا کی اس تحریک کا یہ اثر ہوا کہ سارے ہندوستان میں پڑھے لکھے لوگ اُردو بولنے، اُردو پڑھنے اور اُردو لکھنے لگے۔ چنانچہ ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں میں اُردو ادب پڑھنے افسانے میں لکھنے اور نظمیں، غزلیں کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور قیام پاکستان کے بعد پاکستان میں تو ہر گھر میں اُردو بولی اور لکھی جانے لگی، اور اس زبان میں ادب کی تخلیق کا سلسلہ بھی عام ہو گیا۔ سینکڑوں کی تعداد میں ادیب اور شاعر پیدا ہونے لگے۔ اس طرح اُردو نہ صرف پاکستان کی قومی زبان بن گئی بلکہ اُس کی بدولت پاکستانی معاشرے میں ادب کا صحت مندانہ ماحول بھی پیدا ہو گیا۔

مولانا نے اپنے فکر و عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ اُردو کے ادیب اور انشاء پرداز ہی نہیں، اس زبان کے محسن اور سپاہی بھی ہیں۔ جب ایوب خاں پاکستان کے صدر تھے تو انہیں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ اُردو کا رسم الخط بدل کر ترکی کی طرح رومن کر دیا جائے۔ اس طرح اُردو اور بنگالی اور پاکستان کی دوسری علاقائی زبانیں ایک دوسرے کے قریب آ جائیں گی۔ جب مولانا کو یہ خبر ملی تو انہوں نے مارشل لاء کی پروا کئے بغیر اس کے خلاف ایک نعرۂ مستانہ بلند کیا، اور زوردار آواز میں یہ کہا کہ اُردو کا رسم خط ہماری صدیوں کی تہذیبی روایت کی نشانی ہے، اس لئے اگر حکومت نے ایسا کیا تو اس کو ہماری لاشوں پر سے گذرنا پڑے گا۔ مولانا کے اس نعرۂ مستانہ نے حکومت کی صفوں میں ہلچل پیدا کر دی، اور اس تجویز کو واپس لے لیا گیا۔ یہ مولانا ہی کا کارنامہ تھا ورنہ آج ہم شاید ترکی کی طرح رومن حروف میں اُردو لکھتے ہوتے اور ہماری صدیوں کی اس عظیم اور حسین تہذیبی روایت کا خاتمہ ہو گیا ہوتا جس کی روح ہمارے نستعلیق

رسم الخط میں ہوئی ہوئی تھی۔

ہمارے ہاں ادبی کتابیں پڑھنے اور خرید کر پڑھنے کا رواج بہت کم ہے۔ مولانا نے اس صورت حال کو شدت کے ساتھ محسوس کیا، اور سستی اور خوبصورت کتابیں چھاپنے کے کئی منصوبے بنائے۔ چنانچہ انہوں نے کلاسیکی ادب اور جدید ادب کی بعض اہم کتابیں شائع کیں جس کی قیمت بہت ہی کم رکھی۔ اس خیال سے کہ ہر شخص اُن کو آسانی سے خرید سکے اور اس طرح ہر گھر میں ایک مختصر سی لائبریری بن جائے۔ انہوں نے ادبی دُنیا کے صفحات میں اضافہ کر کے اس کی قیمت صرف ایک روپیہ رکھی تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس رسالے کو خرید کر پڑھ سکیں اور اس طرح ہر گھر میں ادبی ماحول پیدا ہو جائے۔

مولانا طبعاً رومانی اور حسن و جمال کے شیدائی تھے۔ خوبصورت لوگوں، خوبصورت کتابوں، خوبصورت ماحول، خوبصورت مناظر سے خوبصورت باتوں اور خوش ذائقہ اور لذیذ چیزوں سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔ مولانا ان سب چیزوں کا اہتمام کرتے تھے، اور اپنی گفتگو، اپنے انداز، اپنے طور طریقوں اور اپنی تحریروں سے حسن و جمال کے دریا بہاتے تھے۔

ایک دن چائے کی کسی دعوت میں مولانا میرے ساتھ شریک تھے، اور پاس ہی بیٹھے تھے، برفی کی پلیٹ ذرا فاصلے پر رکھی تھی۔ چاندی کا ورق اس پر اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ مولانا دیر تک اس پلیٹ کی طرف شوق اور حسرت سے دیکھتے رہے۔ بالآخر جب نہ رہا گیا تو کہنے لگے "ذرا برفی کی پلیٹ اٹھائیے۔ جانتا ہوں کہ میٹھی چیزیں میرے لئے زہر سے کم نہیں لیکن جی چاہتا ہے کہ اس خوبصورت اور خوش ذائقہ برفی کی لذت سے محروم نہ رہوں۔ انسولین کا انجکشن ایک اور لگوا لوں گا"۔

میں نے یہ باتیں سُن کر برفی کی پلیٹ اُٹھا کر مولانا کو پیش کی۔ انہوں نے بڑے شوق سے یہ برفی کھائی، اور اس کے ساتھ مزے مزے کی باتیں کیں"۔

میں نے اُن کی دلدہی کے لئے کہا کہ "مولانا! ان معاملات میں اتنا پرہیز نہیں

کرنا چاہیئے۔ کھائیے، خوب کھائیے"۔

مولانا میری یہ باتیں سن کر بہت خوش ہوئے۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا مولانا صلاح الدین ایک صاحب طرز ادیب اور انشاء پرداز تھے۔ الفاظ سے حسن وجمال کی تخلیق کا ہنر انہیں خوب آتا تھا ___ وہ اپنے اسلوب اور اندازِ نگارش کی شگفتگی اور شادابی سے گل وگلزار سے کھلاتے تھے۔ جس کی بدولت سیکڑوں اور ہزاروں انسانوں کے لئے مسرتوں اور شادمانیوں کا سامان فراہم ہوتا تھا ___ اُن کے کارنامے تو بے شمار ہیں لیکن یہ کارنامہ تو ایسا ہے کہ جب تک اُردو زندہ ہے، اُردو ادب زندہ ہے، پاکستان زندہ ہے، پاکستانی قوم زندہ ہے، اُن کے شگفتہ وشاداب اسلوب اور حسین وجمیل اندازِ نگارش کی چاندنی لوگوں کے دلوں کو لبھاتی رہے گی۔

ایسی حسین وجمیل، پہلودار اور رنگا رنگ شخصیت کے لوگ کسی قوم میں کبھی کبھی ہی پیدا ہوتے ہیں، اور رنگ ونور کی ان گنت دُنیائیں اپنے پیچھے چھوڑ کر اس دُنیا سے رُخصت ہو جاتے ہیں۔

مولانا صلاح الدین ایسے ہی لوگوں میں سے تھے!

مصورِ مشرق
عبدالرحمٰن چغتائی

مصورِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی نہ صرف برِعظیم ہند و پاکستان بلکہ دُنیا کے عظیم مصوروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ آج بھی ساری دُنیا میں اُن کی بنائی ہوئی تصویروں کی دُھوم ہے۔ انہوں نے مصوری کے فن کو نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کیا۔ ایک نئے انداز اور ایک نئے اسلوب کی داغ بیل ڈالی۔ یہ رنگ و آہنگ انہیں کے ہاتھوں تخلیق ہوا۔ انہیں کے ہاتھوں فنِ مصوری کے افق پر ماہتاب و آفتاب بن کر چمکا۔ اور انہیں کے ساتھ ختم ہوگیا۔ کوئی اور اس کی پیروی نہ کر سکا۔ اس لئے کہ وہ چغتائی کا فن تھا۔ اور اُس میں جو انفرادیت تھی اس کو اپنانا کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی۔ عبدالرحمٰن چغتائی بہت بڑے فن کار تھے۔ اُن کا فن رہتی دُنیا تک زندہ و تابندہ رہے گا۔ اور مصوری کے فنِ لطیف سے دلچسپی رکھنے والے ہمیشہ ہمیشہ اس کے حُسن و جمال کی دُور دُور تک چھٹکی ہوئی چاندنی سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔

میں بچپن ہی سے چغتائی صاحب کے فن کا دلدادہ تھا۔ اُن کی تصویریں جو اس زمانے میں مختلف رسالوں میں شائع ہوتی تھیں میں انہیں کاٹ کر اپنے البم کی زینت بنا لیا کرتا تھا۔ چند سال میں اِن تصویروں کی خاصی تعداد میرے پاس جمع ہو گئی تھی۔

میں گھنٹوں ان تصویروں کو دیکھتا تھا اور اُن کے خطوط اور رنگوں کے حُسن و جمال کی داد دیتا تھا۔ ان تصویروں کی کچھ ایسی کیفیت تھی جس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ صرف اُن کے حُسن و جمال کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔ ان تصویروں میں جو دلکشی اور دلآویزی تھی اس کو میں نے شدت سے محسوس کیا۔ اور میں چغتائی صاحب کے فن کا پرستار ہو گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب چغتائی صاحب کے فن کی شہرت سارے ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل چکی تھی کشمیر سے راس کماری تک اور خیبر سے بنگال تک اُن کے فن کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ بنگال اسکول کے علم بردار تک اُن کے فن کی تعریف کرتے تھے۔ رابندر ناتھ ٹیگور تک اُن کے فن کے پرستار تھے۔ ہندوستان کی ریاستوں اور حکومت ہند کے ایوانوں میں بھی اُن کے فن کا طوطی بولتا تھا۔ یورپ میں بھی اُن کے فن کی دھوم تھی، اور اس عہد کے بیشتر بین الاقوامی شہرت رکھنے والے مُصوّر اور فن کار اُن کے فن کے پرستار تھے۔

اسی زمانے میں چغتائی صاحب نے دیوانِ غالب مُصوّر کیا اور نقش چغتائی اور مُرقّع چغتائی کے نام سے اُن تصویروں کو چھاپ دیا جو غالب کے مختلف اشعار کو سامنے رکھ کر اُنھوں نے بنائی تھیں۔ یہ تصویریں کیا تھیں رنگ و نور کے پیکر تھے جو چغتائی کے موقلم نے تراشے تھے۔ گھر گھر مُرقّع چغتائی، اور غالب کا چرچا تھا۔ میری عمر اُس وقت دس سال سے زیادہ نہیں تھی اس لئے میں ان تصویروں کی معنویت اور اُن کے جمالیاتی پہلو کو سمجھ نہیں سکتا تھا لیکن غالب کے اشعار پر بنائی ہوئی یہ تصویریں میرے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی تھیں، اور میں گھنٹوں مُرقّع چغتائی کی ان تصویروں کو دیکھا کرتا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے اس پر جو مقدمہ لکھا تھا، اس کو بھی پڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ کچھ باتیں سمجھ میں آتی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتی تھیں، لیکن علامہ کے مقدمے اور چغتائی صاحب کے مضمون سے مجھے چغتائی صاحب کی شخصیت اور فن سے آشنا ہونے کا موقع ضرور ملا تھا۔

چغتائی صاحب کی عمر اُس وقت تیس بتیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس عمر میں انسان اور خصوصاً ایک مصوّر اور شاعر کی جو جذباتی اور ذہنی کیفیت ہوتی ہے، وہ چغتائی کے فن میں اس زمانے میں اپنے شباب پر تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس شخص کی آنکھوں کے سامنے رنگین پردے پڑے ہوئے ہیں اور وہ اپنی آنکھوں سے انسانی زندگی کے حسن مظاہر و مناظر کو دیکھ رہا ہے۔ وہ رنگ و نور میں نہائے ہوئے ہیں۔ غالب کے اشعار پر بنائی ہوئی چغتائی کی تصویروں میں یہی کیفیت مجھے نمایاں نظر آئی۔ اور میں اُن سے جی بھر کے لُطف اندوز ہوا۔ اور چغتائی صاحب کے فن کی عظمت کا سکّہ میرے دل پر کچھ ایسا بیٹھا کہ میں زندگی بھر اس کا شیدائی رہا۔

اس عالم میں پندرہ بیس سال گذر گئے۔ اور پھر پاکستان کا قیام عمل میں آگیا۔ اور میں آگ اور خون کے دریاؤں کو عبور کر کے کسی طرح لاہور پہنچا۔ لاہور اُردو کا ایک اہم مرکز تھا۔ یہاں اُردو کے بڑے بڑے ادیب تھے۔ شاعر تھے۔ بڑے بڑے ناشر تھے جن سے مجھے دلچسپی تھی۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس شہر میں عبدالرحمن چغتائی تھے، جن کا میں پرانا پرستار تھا۔ اُن سے ملنے کی خواہش میرے دل میں ایک زمانے سے مچل رہی تھی۔ لیکن لاہور آنے کے بعد چند مہینے تک میری ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ شروع شروع میں میں اس شہر میں کچھ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ اور کچھ چغتائی صاحب کی مصروفیت اور کم آمیزی تھی۔ مجھے اس کا علم ہو گیا تھا اس لئے شروع شروع میں ایک حجاب سا رہا اور میں نے اُن سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔

لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ اسی زمانے میں رسالہ ہمایوں کے اڈیٹر میاں بشیر احمد صاحب نے اپنی جائے قیام "المنظر" میں ایک چائے پارٹی کا اہتمام کیا۔ اس کا مقصد ادیبوں، شاعروں اور مصوّروں کو ایک جگہ جمع کرنا۔ اور اُن سے ملنا تھا۔ میاں صاحب نے مجھے بھی اس محفل میں شرکت کی دعوت دی۔ یہیں چغتائی صاحب سے میری پہلی مُلاقات ہوئی۔

یہ نومبر کے ابتدائی دن تھے۔ گلابی جاڑوں کی آمد آمد تھی۔ موسم نہایت خوشگوار

تھا۔ میں پانچ بجے کے قریب المنظر پہنچا تو دیکھا سامنے لان میں کچھ لوگ بیٹھے
ہوئے ہیں۔ اور میاں بشیر احمد صاحب ہر ایک کے پاس جا کر اپنے مخصوص انداز
میں باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے ذرا دور سے دیکھا تو میرے قریب آئے اور مجھے اپنے
ساتھ احباب کے پاس لے گئے۔ ایک ایک سے فرداً فرداً میرا تعارف کرایا۔ ان
میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم جسٹس ایس۔ اے رحمن، میاں فدا حسین، مولانا صلاح الدین
فیض صاحب، ڈاکٹر عبداللہ، کچھ نئے ادیب اور شاعر میاں صاحب کے خاندان کے
کچھ افراد، اُن کے احباب اور عبدالرحمن چغتائی صاحب تھے۔ میں سب سے مل کر اور
رسمی سی باتیں کر کے چغتائی صاحب کے پاس بیٹھ گیا، اور اُن سے باتیں کرنے لگا۔

میں نے چغتائی صاحب سے کہا "ایک زمانے سے آپ کو دیکھنے اور آپ سے
ملنے کی خواہش تھی۔ میری خوش قسمتی ہے کہ آج آپ سے ملاقات ہو گئی۔"

چغتائی صاحب کہنے لگے "مجھے آپ کے لاہور آنے کی اطلاع مل گئی تھی۔
لیکن میں مصروف بہت تھا۔ اس لئے گھر سے باہر نہ نکل سکا۔ آج میاں صاحب کے
اصرار پر یہاں آیا۔ اس خیال سے کہ آپ بھی یہاں ہوں گے۔ ملاقات ہو جائے گی۔
ویسے آپ سے غائبانہ تعارف تو ایک زمانے سے ہے۔ آپ کے مضامین لاہور کے
ادبی رسالوں میں پڑھتا رہا ہوں۔ مصوری کے ساتھ ساتھ ادب سے بھی مجھے دلچسپی
ہے۔ مضامین اور افسانے لکھتا ہوں۔"

میں نے کہا "مجھے ادب سے آپ کی دلچسپی کا علم ہے۔ میں نے آپ کے افسانے
اور مضامین مختلف رسالوں میں پڑھے ہیں۔ آپ کی تحریریں ماشاء اللہ نہایت شگفتہ و
شاداب ہیں۔ میں ان تحریروں سے لطف اندوز ہوا ہوں۔ آپ کی بنائی ہوئی تصویروں
سے تو مجھے عشق ہے۔"

میری یہ باتیں سُن کر چغتائی صاحب نے عاجزی اور انکساری کا اظہار کیا جس سے
میں نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ عظیم فن کار ہیں، اور خود اُن کو اپنی بڑائی کا احساس نہیں ہے،
اور یہی ایک عظیم فن کار کی خصوصیت ہے۔

غرض دیر تک میں چغتائی صاحب سے باتیں کرتا رہا۔ پھر رحمٰن صاحب اور فیض صاحب بھی ہمارے پاس آکر بیٹھ گئے۔ اُن سے بھی باتیں ہوتی رہیں۔ سب بڑی محبت سے ملے اور یہ لوگ بھی میرا حال احوال پوچھتے رہے۔

اسی اثنا میں میاں صاحب ہمارے پاس آئے۔ اور کہا "اندر تشریف لے چلیے۔ چائے کا انتظام کوٹھی کے اندر ہے۔ وہاں بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کریں گے۔"

چنانچہ ہم لوگ کوٹھی کے اندر میاں صاحب کے ڈرائنگ روم میں گئے اور وہاں چائے پیتے رہے اور باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

مغرب کے بعد یہ دلچسپ محفل ختم ہوئی، اور ہم لوگ ایک دوسرے سے مل کر اور میاں صاحب کا شکریہ ادا کر کے المنظر سے رخصت ہوئے۔

چلتے وقت چغتائی صاحب نے کہا "میری تصویروں کی نمائش اسی مہینے الحمرا میں ہونے والی ہے۔ اس کی افتتاحی تقریب میں ضرور شرکت کیجیے گا۔ دعوت نامہ آپ کو پہنچ جائے گا۔"

میں نے کہا "میں انشاءاللہ ضرور حاضر ہوں گا۔ میرے لئے اس میں شرکت ایک سعادت ہوگی۔"

المنظر سے نکل کر میں لارنس باغ میں آیا۔ ملگجی سی چاندنی میں تھوڑی دیر اس حسین و دلفریب باغ کی سیر کرتا رہا، اور یہ سوچتا رہا کہ چغتائی صاحب اپنی فن کارانہ بے نیازی کے باوجود کیسی دلچسپ شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ کتنی محبت سے ملے۔ کس درجہ عاجزی اور انکساری کے ساتھ انہوں نے مجھ سے باتیں کیں اور میرے ساتھ کس قدر خلوص کا اظہار کیا۔

اُن کی یہ تصویر آنکھوں میں پھرتی رہی۔

بلند و بالا قد و قامت، بھرا بھرا جسم، سیاہی مائل، گندمی رنگ، لمبے کتابی چہرے پر ہٹلر کے انداز کی مونچھیں، سر پر بڑے بڑے بال پیچھے کی طرف لوٹتے ہوئے، جسم پر پرانے فیشن کا سُوٹ، اس پر سادہ سی ٹائی، چہرے پر سنجیدگی کا بوجھ،

ہنسی اور مسکراہٹ سے محروم، آواز گرج دار باتوں میں بے ربطی لیکن اس کے باوجود ایک عجیب طرح کی شگفتگی اور شادابی سے مالا مال۔

یہ تھے مصورِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی جن سے آج میری پہلی ملاقات ہوئی۔ اور جن کی شخصیت کے گہرے نقوش میرے دل و دماغ پر ثبت ہوئے۔ اور میں لارنس گارڈن کی رنگین فضاؤں میں گھوم پھر کر یہ سوچتا رہا کہ اس شخص میں کتنی سادگی ہے۔ اس کو اپنی بڑائی کا مطلق احساس نہیں۔ یہ نہ صرف برِ عظیم ہندوپاکستان بلکہ دنیا کا بہت بڑا مصور ہے لیکن اس نے اپنے فن کے بارے میں کوئی بات ہی نہیں کی۔ اُس کے مزاج میں کیسی انکساری اور کس درجہ عاجزی ہے۔ وہ مجھ سے ایسے خلوص اور محبت سے ملا کہ یوں محسوس ہوا جیسے برسوں کی شناسائی ہے۔ پھر اس نے اپنی تصویروں کی نمائش میں شرکت کی دعوت بھی دے دی۔

اس طرح کے خیالات میرے ذہن کے افق پر منڈلاتے رہے۔ اور میں ایک عجب طرح کی مسرت کے جلو میں لارنس باغ میں چہل قدمی کرتا رہا۔

دو تین ہفتے کے بعد الحمرا میں چغتائی صاحب کی تصویروں کی نمائش کا دعوت نامہ میرے پاس آیا۔ اس کے ساتھ چغتائی صاحب کی زندگی، شخصیت اور اُن کے فن کے بارے میں کچھ پمفلٹ بھی تھے، جن سے مجھے اس عظیم مُصوّر کے حالات کی تفصیل کا علم ہوا، اور اُن کے بارے میں ایسی معلومات فراہم ہوئی جس کا اس سے قبل مجھے علم نہیں تھا۔ اس دعوت نامے کے ساتھ چغتائی صاحب کی بنائی ہوئی ایک خوبصورت تصویر بھی تھی، جس کو نمائش کے موقع پر نہایت اہتمام سے چھاپا گیا تھا۔

چغتائی صاحب کے چھوٹے بھائی عبدالرحیم چغتائی صاحب یہ دعوت نامہ لے کر اورینٹل کالج میں میرے پاس آئے۔ بے تکلفی سے دروازہ کھول کر میرے کمرے میں داخل ہوئے اور کہنے لگے "نمائش کا یہ دعوت نامہ چغتائی صاحب نے آپ کو بھیجا ہے۔ اور کہا ہے کہ نمائش کی افتتاحی تقریب میں ضرور آئیے گا۔ آپ کی شرکت اس میں ضروری ہے۔"

میں نے کہا "بہت بہت شکریہ! میں انشاءاللہ ضرور حاضر ہوں گا۔ آپ تشریف رکھیئے۔ ایک پیالی چائے پی لیجیئے"۔

لیکن وہ بیٹھے نہیں۔ چند منٹ کھڑے کھڑے انہوں نے مجھ سے دو ایک باتیں کیں۔ دعوت نامہ مجھے دیا، اور یہ کہہ کر چلے گئے کہ "میں ذرا جلدی میں ہوں۔ کام بہت ہے"۔

عبدالرحیم چغتائی صاحب بھی خوب آدمی تھے! اس کے بعد بھی اُن سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ اورینٹل کالج میں بے تکلفی سے آتے تھے۔ مجھ سے ملتے تھے۔ چغتائی صاحب کا پیغام دیتے تھے لیکن کبھی بیٹھتے نہیں تھے۔ کھڑے کھڑے کام کی باتیں کر کے چلے جاتے تھے۔

دو تین ہفتے بعد الحمرا میں چغتائی صاحب کی تصویروں کی نمائش ہوئی۔ میں بھی اس کی افتتاحی تقریب میں شریک ہوا۔ چغتائی صاحب انتظامات میں مصروف تھے۔ میں وقت سے کچھ پہلے پہنچ گیا تھا۔ اس لئے مجھے اُن سے ملنے اور چند باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ بڑی محبت سے پیش آئے۔

کہنے لگے "آپ کے آنے سے مجھے خوشی ہوئی۔ نمائش کا انتظام صحیح طور پر ہوا ہے۔ بعض عزیزوں اور دوستوں نے بڑی مدد کی ہے۔ اس کی خوش سلیقگی کا سہرا انہیں کے سر ہے"۔

میں نے کہا "آپ کی نگرانی میں جو کام ہوگا اس میں فن کارانہ خوش سلیقگی تو یقیناً ہوگی۔ آپ نے تو دُنیا کے مختلف ممالک کی آرٹ گیلریاں اور نمائشیں دیکھی ہیں۔ آپ کے تجربات کی روشنی میں یہ کام ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں سلیقہ تو ہونا ہی چاہیئے"۔

چغتائی صاحب چند منٹ اس قسم کی باتیں کر کے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ میں بیٹھ گیا اور افتتاحی تقریب کے شروع ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

مقررہ وقت پر یہ شروع ہوئی۔ جسٹس رحمٰن صاحب نے صدارت کی۔ چند تقریریں ہوئیں، لیکن چغتائی صاحب نے کچھ نہیں کہا۔ خاموش بیٹھے رہے۔ اُن کی

بنائی ہوئی تصویریں نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ رہی تھیں۔ انہیں کچھ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔

میں نے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اس نمائش کو دیکھنے میں گذارا۔ بہت لطف آیا۔ چغتائی صاحب کی عظمت کا سکّہ دل پر بیٹھ گیا۔

جلسہ ختم ہوا تو میں نے چغتائی صاحب سے اجازت لی۔ انہوں نے یہ کہہ کر مجھے رخصت کیا "انشاءاللہ آپ سے ملاقات ہوتی رہے گی۔ کسی روز میرے ہاں ضرور تشریف لائیے۔ آپ کو اپنا سٹوڈیو دکھاؤں گا۔ باتیں بھی ہوں گی"۔

میں نے کہا "انشاءاللہ ضرور حاضر ہوں گا"۔

چنانچہ کئی بار اُن کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب چغتائی صاحب اتنے زیادہ گوشہ نشین نہیں ہوئے تھے جیسے کہ بعد میں ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں وہ لوگوں سے مل لیتے تھے، اور باتیں بھی کر لیتے تھے۔ خاطر تواضع بھی کرتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ اپنے کام میں اتنے مصروف ہو گئے تھے کہ ملنے جلنے سے کترانے لگے تھے۔ کم آمیز اور کم سخن تو وہ ہمیشہ سے تھے۔ لیکن اُن کی زندگی کے آخری بیس پچیس سال ایسے تھے کہ وہ ملنے جلنے سے گھبرانے لگے تھے۔ البتہ میرے لئے اُن کے دروازے ہمیشہ کھلے رہے۔ لیکن میں خود اُن کی ذہنی کیفیت کو سمجھ کر اُن سے ذرا کم ملتا تھا۔ خط و کتابت ہوتی رہتی تھی، اور اُن کے چھوٹے بھائی عبدالرحیم چغتائی صاحب ہمارے درمیان رابطے کا ایک ذریعہ اور وسیلہ تھے۔ وہ جب بھی میرے پاس آتے تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے چغتائی صاحب خود آگئے ہیں۔

اس زمانے میں میری جو کتابیں مختلف اداروں سے شائع ہوئیں اُن کے سرورق کے ڈیزائن چغتائی صاحب نے بڑی محبت سے بنائے۔ صرف انہیں کتاب کا نام اور موضوعات کی تفصیل کا لکھنا کافی ہوتا تھا۔ چغتائی ان کو سامنے رکھ کر سرورق کا ڈیزائن بنا دیتے تھے، اور کیا خوب بناتے تھے۔ ہر ڈیزائن مصوری کا شاہکار ہوتا تھا، اور اُن میں چغتائی صاحب کی فن کاری اپنے شباب پر نظر آتی تھی۔ ان میں رنگ وہ خود لگاتے تھے، اور یہ رنگ اتنے خوبصورت ہوتے تھے کہ دلوں میں سکّہ بناتے اور حواس پر چھا

جاتے تھے۔ تقریباً ربع صدی تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس زمانے میں مختلف اداروں نے میری جو کتابیں شائع کیں ان میں روایت کی اہمیت، غزل اور مطالعۂ غزل، جدید شاعری، مومن اور مطالعۂ مومن، غالب اور مطالعۂ غالب اور غالب کا فن کے جو ٹائٹل انہوں نے بنائے، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

غالب سے چغتائی صاحب کو جو دلچسپی تھی، اُس کا علمی دُنیا کو بخوبی علم ہے۔ جب غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر میری کتابیں شائع ہوئیں تو غالب سے اپنی دلچسپی ہی کے پیشِ نظر انہوں نے نہایت حسین ٹائٹل بنا کر بھیجے اور اُن کے ساتھ مجھے یہ خط بھی لکھا:۔

ایم۔ اے رحمٰن چغتائی
پریمکی، راوی روڈ، لاہور
۶۹/۸/۱۲

مکرمی و معظمی ڈاکٹر عبادت صاحب، سلام مسنون

غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں جس قدر کتابیں ظہور میں آئی ہیں، آپ کی تصنیف غالب کا فن ایک ایسی انفرادی حیثیت کی حامل ہے جو آپ کا حصّہ ہے۔

آپ کی کوئی بھی تصنیف نظر انداز نہیں کی جا سکتی مگر غالب پر جس انداز سے آپ نے تنقید کی ہے اور تبصرہ کیا ہے۔ غالب کی شخصیت کی دکاسی سے استعارات اور تشبیہات کا آہنگ پیدا کیا ہے، اور ان کی شادابی اور شگفتگی کا عالم، جو آپ کی سوجھ بوجھ نے روح کی بالیدگی کا سامان مہیا کیا ہے وہ آپ کی تحریر کا کرشمہ ہے۔

غالب سے اپنا رشتہ بھی اپنے آرٹ کے لگ بھگ ہے لیکن غالب کا اپنا رشتہ نسلِ انسانی سے ناباد ہے۔ میں چاہتا ہوں غالب کی کچھ اور بھی خدمت انجام دے سکوں تاکہ اس کے مداح دنیا بھر میں نظر آئیں۔ مرقع

چغتائی غالب کا مصور ایڈیشن آپ کے سامنے ہے۔ اور آج اُردو کی یہ کتاب دُنیا کی بڑی بڑی لائبریریوں اور عجائب گھروں میں موجود ہے۔

مرقع اور نقش چغتائی کی مقبولیت کے پیش نظر ایک اور پروگرام ہے خدا توفیق دے کہ میں اس کو پورا کرسکوں۔ اور کارِ چغتائی کو شائع کرسکوں۔

والسلام
مخلص چغتائی

چغتائی صاحب کے اس خط کو میں نے یہاں صرف اس خیال سے نقل کیا ہے کہ اس سے اُن کے بے پایاں خلوص اور اُن کی بے اندازہ محبت کا علم ہوتا ہے۔ اس کا مقصد خود ستائی نہیں ہے۔ چغتائی صاحب محبت کرنے والے انسان تھے۔ اور وہ ہر ایک سے حد درجہ خلوص اور محبت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اتنے بڑے بین الاقوامی شہرت کے مصور کا بغیر کسی منفعت کے کتابوں کے ٹائیٹل بنانا۔ ان کتابوں کا پڑھنا۔ اور پھر اُن کے بارے میں تفصیل سے اظہار خیال کرنا۔ یہ سب کچھ چغتائی صاحب ہی کر سکتے تھے۔ اور یہ سب کچھ اُن سے وہ محبت کرواتی تھی جس کا وہ ایک حسین مجسمہ تھے۔ اُن کے اس قسم کے بے شمار خطوط میرے پاس محفوظ ہیں جن کے ایک ایک لفظ سے محبت کا رس ٹپکتا ہے۔ ان خطوں میں میری تعریف ہے، شفقت اور محبت کا اظہار ہے اور مفید مشورے ہیں۔

چغتائی صاحب بہت مصروف آدمی تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ یہ سب کچھ کرتے تھے۔ اُن کی مصروفیت کا عالم یہ تھا کہ وہ دن دن بھر اور رات رات بھر اپنے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ اُن کے پاس ضائع کرنے کے لئے ایک لمحہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ تھے اور اُن کا اسٹوڈیو تھا، اور اُن کی تصویریں تھیں جن کی نوک پلک درست کرنے میں وہ شب و روز مصروف رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے زندگی میں اتنا کام کیا کہ کئی آدمی مل کر بھی اتنا کام نہ کر سکتے۔ انہوں نے ہزارہا تصویریں بنائیں، اور ایسی تصویریں بنائیں جن میں سے بیشتر مصوری کے فن میں عجائبات کی حیثیت رکھتی ہیں، شاید

ہی اس دور کے کسی مُصوّر نے اتنی تعداد میں ایسی خوبصورت تصویریں بنائی ہوں گی چغتائی صاحب اس اعتبار سے مُصوّری کی دنیا میں ایک انفرادی شان سے جلوہ گر نظر آتے ہیں۔

مُصوّرِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی تقریباً نصف صدی تک تخلیق حُسن وجمال کے اِس کاروبار میں مصروف رہے۔ کام کرنے کی لگن اور دُھن ان کے اندر ایسی تھی کہ اُنہیں اپنا ہوش نہیں تھا۔ اس کام میں محویت اور مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے لوگوں سے ملنا جُلنا تک چھوڑ دیا تھا۔ دوستوں تک سے مِلنے سے وہ کترانے لگے تھے۔ اور بعض لوگوں نے تو یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ چغتائی صاحب بہت مغرور ہوگئے ہیں۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں تھی۔ اُن کے پاس ملنے والوں کے لئے وقت ہی نہیں تھا۔ اُن سے ملتے کیسے؟ اُن کا کام انہیں اپنی طرف اس طرح کھینچتا تھا کہ وہ آس پاس اور گرد و پیش سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ صرف کام اُن کی زندگی بن گیا تھا۔ تکبّر اور غرور اُن میں نام کو نہیں تھا۔

لڑکپن اور جوانی کے زمانے میں چغتائی صاحب اتنے کم آمیز اور گوشہ نشین نہیں تھے۔ احباب سے مِلتے تھے محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ شکار کھیلتے تھے، سفر کرتے تھے۔ لیکن جب اُن کے خیال میں اُن کے پاس وقت کم رہ گیا تو انہوں نے یہ سب کچھ چھوڑ کر اپنے فن سے لَو لگائی۔ دنیا و مافیہا کو فراموش کر دیا، اور اپنے اسٹوڈیو میں گوشہ نشین ہو گئے، مرتے دم تک اُن کی گوشہ نشینی کا یہی عالم رہا۔ اور اُن کی زندگی تخلیق حسن وجمال کے لئے وقف رہی۔

ویسے چغتائی صاحب اپنی اس گوشہ نشینی کے باوجود بڑے ہی با اخلاق آدمی تھے۔ دوستوں کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ ہر ایک کے ساتھ نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ پیش آتے تھے۔ انہیں اپنی بڑائی کا احساس بالکل نہیں تھا، حالانکہ وہ دُنیا کے گنتی کے چند عظیم مُصوّروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ مُلکوں مُلکوں اُن کی شہرت تھی۔ فن کاروں کے ساتھ ساتھ مُہذب دنیا کے سربراہانِ مملکت تک اُن کے فن کے شیدائی تھے۔

چغتائی صاحب میں ہوسِ زر بالکل نہیں تھی۔ وہ پیسوں کے لئے کام نہیں کرتے

تھے۔ وہ تو فن کی دُنیا میں اس طرح ڈوبے ہوئے تھے کہ انہیں مادی چیزوں سے کوئی خاص دلچسپی ہی نہیں رہی تھی۔ فن سے محبت اور تخلیق جمال کی شیفتگی نے اُنہیں دُنیاوی اشیاء سے بے نیاز کر دیا تھا۔ دُنیا کی دولت اُن کے لئے بے حقیقت اور بے مصرف تھی۔ وہ تو فن کی زلف گرہ گیر کے اسیر تھے۔ اُن کی دولت تو فن لطیف کی تخلیق و تشکیل تھی۔ وہ جب اپنے مخصوص انداز میں خط کھینچتے اور رنگ بکھرتے تھے تو دُنیا جہاں کی دولت بیش بہا اُن کے ہاتھ آجاتی تھی، اور وہ مسرت کی ایک ایسی نعمت سے مالا مال ہو جاتے تھے جس پر دُنیا کی تمام دولتوں کو نثار کیا جا سکتا ہے۔ وہ درویشی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ظاہری نمود و نمائش اور مادی آرام و آسائش سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ انہیں تو اپنے فن کے پرستاروں کی تلاش تھی، اور جب اس فن سے کوئی دلچسپی کا اظہار کرتا تھا، اور وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ اُس کی اس دلچسپی میں خلوص و صداقت ہے تو وہ اپنے جگر کے ٹکڑوں، یعنی اپنے فن کے شہ پاروں کو بغیر کسی معاوضے کے اس کو دے کر ایک عجب طرح کی طمانیت محسوس کرتے تھے۔

خدا جانے کتنے ہی اپنے فن کے پرستاروں کو انہوں نے اپنے فن کے شاہکار عطا کئے اور اس کی کبھی کوئی قیمت نہیں لی۔ اگر کبھی کسی دوست نے اس کی قیمت لگانے کی کوشش کی تو انہوں نے اس کو اپنی ذات اور اپنے فن کی توہین تصور کیا اور ناراض ہوئے۔ کیونکہ اُن کے خیال میں اُن کے فن کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ وہ اس کو معاوضے سے بالاتر سمجھتے تھے۔ اُن کے نزدیک تو اُس کی قیمت صرف اس کی تفہیم، اس سے دلچسپی اور اس کے ساتھ والہانہ شیفتگی تھی۔ بس اسی کو وہ اپنے فن کا معاوضہ سمجھتے تھے۔

عرصہ ہوا انگلستان کی ملکہ الزبتھ لاہور آئیں تو انہوں نے سفیر انگلستان کے ذریعے سے چغتائی صاحب سے ملنے، اُن کے اسٹوڈیو کو دیکھنے اور اُن کی بنائی ہوئی چند تصویروں کو حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ چغتائی صاحب اُن کا استقبال کرنے اور اپنے اسٹوڈیو کو دکھانے پر بخوشی آمادہ ہو گئے۔ چند تصویریں بھی انہیں پیش کیں، اور یہ کہہ کر معاوضہ لینے سے انکار کیا کہ یہ تو فن کار اور پاکستان کی طرف سے ملکہ کے لئے ایک تحفہ ہے۔

اور یہ اُن کی شخصیت کی عظمت اور کشادہ دلی کا صرف ایک واقعہ نہیں ہے۔ ایسے بے شمار واقعات ہیں جو انہیں ایک عظیم انسان، ایک محب وطن پاکستانی اور ایک بلند مرتبہ فن کار ثابت کرتے ہیں۔

ایک واقعے کو تو میں آج تک نہیں بھولا۔

انتقال سے کچھ عرصے پہلے چغتائی صاحب کے چھوٹے بھائی رحیم صاحب ایک دن میرے پاس اورینٹل کالج میں لدے پھندے آئے۔ اُن کے پاس چغتائی صاحب کی بنائی ہوئی تصویروں کی اس کتاب کے کئی سیٹ تھے جس کو انہوں نے عمل چغتائی کے نام سے نہایت اہتمام سے شائع کیا تھا، اور جس میں علامہ اقبال کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر نہایت دلکش و دلآویز تصویریں بنائی گئی تھیں۔

رحیم صاحب اس عالم میں میرے کمرے کے اندر داخل ہوئے اور کہنے لگے "چغتائی صاحب کچھ علیل ہیں لیکن اس بیماری کے عالم میں بھی انہوں نے یہ تاکید کی ہے کہ اُن کی تصویروں کی یہ کتاب آپ کو اور کچھ دوسرے احباب کو پہنچا دوں۔ اُن کی طرف سے یہ کتاب آپ کی اور بیگم صاحبہ کی نذر ہے۔"

میں نے رحیم صاحب سے کہا "چغتائی صاحب کی محبت بے پایاں ہے۔ مجھ پر اُن کی خاص نوازش ہے۔ حیرت ہے کہ بیماری کی حالت میں بھی اُنہوں نے میرا اور بیگم کا خیال رکھا۔ اُن کا شکریہ کس طرح ادا کروں۔ اُن کے احسانات مجھ پر بے شمار ہیں۔ اُن کو میرا اسلام کہیئے گا اور میری طرف سے مزاج پوچھیئے گا۔ خدا کرے وہ جلد صحت یاب ہو جائیں! میں انہیں خط بھی لکھوں گا اور حاضر بھی ہوں گا۔"

رحیم صاحب یہ کہہ کر رخصت ہوئے کہ "میں آپ کا پیغام چغتائی صاحب کو پہنچا دوں گا۔ آج کل اُن کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن اس عالم میں بھی وہ احباب کو یاد کرتے ہیں۔ آپ کا ذکر تو روزانہ ہوتا ہے۔"

میں نے رحیم صاحب کے جانے کے بعد اس ضخیم اور وزنی کتاب کو گتے کے مضبوط ڈبے میں سے نکال کر دیکھا، اور اس کی ورق گردانی شروع کی۔ پہلے ہی صفحے

پر چغتائی صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ تحریر نظر آئی۔

"ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب اور اُن کی بیگم صاحبہ کی خدمت میں خلوص و محبت کی بنا پر"۔ عبدالرحمٰن چغتائی۔ لاہور

اس کتاب کو دیکھ کر جی خوش ہوا۔ اس لیئے کہ اس میں چغتائی صاحب کی نہایت حسین و جمیل تصویریں تھیں۔ ان تصویروں میں مُصورِ مشرق نے شاعرِ مشرق کے خیالات و نظریات کو حُسن و جمال کے ایسے سانچے میں ڈھال دیا تھا کہ اُن پر نظر ٹھہرتی نہیں تھی۔

کتاب کیا تھی رنگ و نور کا ایک مُرقع تھا۔ ایک البم تھا جس میں چغتائی کے فن کی روح اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ بے نقاب تھی۔

مجھے یوں محسوس ہوا کہ حسن و جمال کا ایک بیش بہا خزانہ میرے ہاتھ آگیا ہے۔

چغتائی صاحب بُنیادی طور پر ایک فن کار تھے۔ وہ ایک خاندانی فن کار تھے۔ فن کا لہو اُن کی رگوں میں دوڑتا تھا۔ وہ لاہور کے ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جو صدیوں سے ہندوستان جنّت نشان میں اپنی فن کارانہ صلاحیتوں اور فنی کارناموں کے لیئے مشہور تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کے آبا و اجداد ہرات سے لاہور آئے، اور یہیں لاہور کے محلہ چابک سواراں میں آباد ہوگئے۔ یہ مغلوں کی حکومت کے شباب کا زمانہ تھا۔

اکبر اعظم کے زمانے سے اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عہد تک علم و حکمت اور ادب و فن کے یہاں دریا بہتے تھے۔ اور ہر شخص اِن کے پانیوں سے اپنے آپ کو سیراب کرتا تھا۔ صرف اس کے لیئے صلاحیت، ہنرمندی اور کام کی لگن ضروری تھی۔

چغتائی صاحب کے بزرگ بھی یہاں آئے اور انہوں نے علم و فن کی دُنیا میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے ان میں ایک بزرگ لطف اللہ مہندس تھے جو شاہجہاں کے زمانے میں ماہر تعمیرات تھے۔ اُن کے استاد اور والد احمد معمار لاہوری تھے جو مغل دربار کے ساتھ منسلک تھے۔ انہوں نے شاہجہاں کی بنائی ہوئی بیشتر عمارتوں کی تعمیر میں حصّہ لیا۔ ان کے فکر و خیال اور حسن عمل کا لہو تاج محل، جامع مسجد اور لال قلعہ کے در و دیوار میں

دوڑا ہوا ہے۔ یہ باتیں چغتائی صاحب کے والد میاں کریم بخش، دادا رحیم بخش پردادا بابا صلاح الدین اور بابا صالح کے ذریعے سے اُن تک پہنچیں۔ بابا صالح مشہور آدمی تھے اور لاہور میں مغل عمارتوں کی تعمیر اور تشکیل و تزئین و آرائش میں پیش پیش رہے تھے۔ ان کے بزرگوں میں سے بعض انجینئر، ماہر تعمیرات اور شاعر و ادیب بھی تھے۔ جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ سب بنیادی طور پر بڑی صلاحیتوں کے لوگ تھے۔

مُصور مشرق عبدالرحمن چغتائی نے اپنی اس خاندانی روایت کی آغوش میں آنکھ کھولی اور فن کے ذوق و شوق، اور جذب و جنوں نے اُن کو ایک اہم فن کار بنا دیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ فن سے اُن کی دلچسپیوں میں اضافہ ہوتا گیا، اور مُصوری کی دُنیا میں تو انہوں نے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ اُن کی شہرت برعظیم ہندوستان و پاکستان سے نکل کر ساری دُنیا میں پھیل گئی۔ اس میں ان کے بزرگوں کی بنائی ہوئی روایت کا گہرا اثر تھا۔

چغتائی صاحب نے اپنے فن کا آغاز بڑے سادہ طریقے سے اپنے خاندان کے بزرگوں کی نگرانی میں کیا۔ وزیر خاں کی مسجد میں بھی کام کیا، نیشنل کالج آف آرٹس میں کچھ عرصے مُصوری کے اُستاد رہے لیکن جب اُن کے اندر کا مُصور باہر آگیا تو وہ مُصوری کے ایک نئے انداز کا راستہ خود تعمیر کر کے اس پر گامزن ہو گئے۔ اور اُن کا یہ سفر تقریباً پچاس ساٹھ سال تک جاری رہا۔ جس کے نتیجے میں بلا مبالغہ ہزاروں کی تعداد میں اُن کی تصویریں منظرِ عام پر آئیں۔ ان تصویروں میں انہوں نے اپنا ایک منفرد انداز پیدا کیا، جو انہیں کے ساتھ مخصوص ہو گیا، اور جس کی وجہ سے مُصورِ مشرق برعظیم کے اسلامی رنگ و آہنگ کی تمام خصوصیات کو اپنے دامنِ فن میں سمیٹ کر ان گنت فنی زاویوں سے پیش کرنے میں خاطر خواہ کامیاب ہوئے۔ اس طرح انہوں نے اپنے مخصوص خطوط اور رنگوں کے حسین امتزاج سے ایسے تخلیقی کارنامے انجام دیئے جن کو دیکھ کر فن کی دُنیا حیران رہ گئی اسی لئے بعضوں نے تو اُن کے فنِ مصوری کو اس عہد کا ایک عجوبہ قرار دیا۔

یہ ایک ایسی ترقی تھی کہ موجودہ دور میں اس کا تو کوئی خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ان کارناموں سے چغتائی صاحب کی عزت میں اضافہ ہوا اور اُن کی شہرت کی خوشبو دُنیا

کے مہذب ملکوں میں دُور دُور تک پھیل گئی۔

اور آج کی دُنیا میں تو چغتائی صاحب کا شمار گنتی کے اُن چند مصوروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اس دور میں فنِ مصوری کی روایت میں گراں قدر اضافہ کیا ہے اور انفرادیت کا تاج زرنگار اپنے سروں پر سجا کر اپنے فن کی ایک ایسی سلطنت قائم کی ہے، جہاں حُسن و جمال کی حکمرانی ہے اور جہاں فنی مہارت کا سکّہ چلتا ہے۔

چغتائی صاحب اپنی اس اقلیم سلطنت کے ایک نہایت ہی معروف اور منفرد فرماں روا تھے۔

اس عظیم مُصوّر کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مشرقی تہذیب اور خصوصاً اسلامی تہذیب کی روح کو اپنے فن میں سمو دیا ہے، اور اپنے خطوط کے بانکپن اور رنگوں کی رنگینی اور رعنائی سے حُسن و جمال کی ایسی دنیائیں تخلیق کی ہیں جو دلوں کو لبھاتی ہیں۔ اور انسانی حواس پر سرخوشی بن کر چھا جاتی ہیں۔ اُن کو دیکھ کر انسان ذہنی اور جذباتی اعتبار سے اپنے آپ کو ترفع سے ہم کنار کر لیتا ہے، اور یہ محسوس کرتا ہے جیسے وہ آسمانوں پر پرواز کر رہا ہے اور چاند تاروں کے جھرمٹ میں شگفتگی و شادابی اور رنگینی و رعنائی کی چاندنی سے ہم کنار ہے۔

چغتائی صاحب بنیادی طور پر ایک رُومانی فن کار تھے، اور اُن کی ہر تصویر میں یہ رومانیت اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ وہ رنگین خواب دیکھتے تھے، اور ان خوابوں کو حقیقت کے سانچے میں ڈھال کر حسن جمال کا روپ دے دینا ہی اُن کے فن کا کمال تھا۔ اُن کا یہ فن انسانی زندگی کی خوبصورتی کا احساس دلاتا ہے جس کی وجہ سے یہ زندگی بسر کرنے، اور ان گنت مسرتوں سے سینہ بھر لینے کی چیز معلوم ہونے لگتی ہے۔ چغتائی حُسن نسوانی کے شیدائی ہیں، اور اس کے ان گنت روپ اُن کے فن میں اپنا جلوہ دکھاتے رہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ دورِ جدید میں چغتائی کے فن کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اُن کی شہرت کی خوشبو شہروں شہروں اور ملکوں ملکوں پھیلی لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ وطن عزیز میں کم لوگ اُن کے فن سے محظوظ و مسرور ہو سکے۔ اس لئے کہ یہاں نہ تو افراد کی ایسی ذہنی

تربیت کی گئی کہ وہ مصوری کے فن کا ذوق و شوق اپنے اندر پیدا کر سکیں اور نہ چغتائی صاحب کا کوئی میوزیم بنایا گیا۔ نہ کوئی ایسی گیلری قائم کی گئی جہاں جا کر لوگ اپنے آپ کو اس مسرت و شادمانی سے ہم کنار کر سکیں جو مصوری کے فن سے حاصل ہوتی ہے۔ چغتائی صاحب نے اس کا خواب دیکھا۔ اور چند ہزار روپے کی جمع کی ہوئی پونجی سے اس کے لئے ایک قطعۂ زمین بھی خریدا لیکن اپنے محدود وسائل کی وجہ سے اس خواب کو حقیقت نہ بنا سکے۔ حکومت نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ فلاحی اداروں نے اس کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ اہل وطن نے اس کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا، اس لئے کہ وہ مادیت کے پیچھے دوڑنے لگے اور حسن و جمال سے لطف اندوز ہونے اور اس سے روحانی تسکین حاصل کرنے کا خیال مادہ پرستی نے اُن کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا۔ جس کے نتیجے میں وہ بہیمت اور درندگی کے راستے پر گامزن ہو گئے۔

ایسی قوم بھلا چغتائی کی قدر کس طرح کرتی، اُن کے اسٹوڈیو کو قومی یادگار کیسے قرار دیتی اور اُن کی ہزار ہا تصویروں کی مستقل نمائش کے لئے اُن کا میوزیم اور اُن کی گیلری کیسے قائم کرتی، مادہ پرستی فن اور فن کاروں کی سب سے بڑی دشمن ہوتی ہے۔ چغتائی صاحب کو زندگی بھر اس کا صدمہ رہا۔ اور وہ دل ہی دل میں افراد کی بے حسی، معاشرے کی بے اعتنائی، حکومت کی بے رُخی اور زمانے کی ستم رانی کے شکوہ سنج رہے۔ لیکن کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ کبھی کوئی شکوہ زبان پر نہیں لائے۔ کبھی کسی سے ستم ہائے روزگار کی شکایت نہیں کی۔ ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ سے بے نیاز ہو کر انہوں نے تخلیق فن میں زندگی کے دن گذارے لیکن یہ خلش انہیں ضرور تڑپاتی رہی کہ ہمارے معاشرے اور ماحول میں فن اور فن کار سے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں۔

اور اسی عالم میں مُصوّری کا یہ عظیم فن کار، یہ صاحب طرز ادیب، اور افسانہ نگار اور آرٹ کی تاریخ و تہذیب کا یہ منفرد مزاج داں، ۱۷ جنوری ۱۹۷۵ء کو اس دُنیا سے رُخصت ہو گیا، اور اپنے پیچھے مُصوّری کے شاہکاروں کی دولت بیش بہا کا ایک ایسا

خزانہ چھوڑ گیا جو ہمیشہ فن کے پرستاروں اور مصوری کے مزاج والوں کے دلوں کو لبھاتا رہے گا اور رہتی دُنیا تک اس کو زندہ رکھے گا ۔

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شُد زعشق
ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما

○

میاں ایم۔ اسلم

دلّی کے دوران قیام میں میرا یہ معمول تھا کہ ہفتے میں دو ایک بار شام کو اینگلو عربک کالج سے نکل کر اجمیری دروازے سے چاوڑی ہوتا ہوا جامع مسجد جاتا تھا، اور تھوڑی دیر ایڈورڈ پارک میں سیر کرتا تھا۔

ایک دن سہ پہر کو میں اُردو بازار میں جامع مسجد سے ایڈورڈ پارک کی طرف جا رہا تھا کہ مجھے دیکھ کر کتب خانہ علم و ادب میں سے رسالہ ساقی کے مُدیر شاہد احمدؔ دہلوی صاحب باہر نکلے۔ مجھے آواز دی اور کہا "میاں! کہاں ٹیڑھے ٹیڑھے جا رہے ہو۔ ذرا دیر کے لئے یہاں کتب خانہ علم و ادب میں آؤ۔ ایک صاحب سے تمہاری مُلاقات کرواتے ہیں۔"

میں اُن کے ساتھ کتب خانہ علم و ادب میں داخل ہوا تو سامنے ایک صاحب بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ جن کا حلیہ کچھ عجیب سا تھا۔ لمبا قد، چھریرا بدن، کُھلتا ہوا گندمی رنگ، سر پر ترکی ٹوپی۔ شلوار پر لمبی قمیص، اس پر لمبا کوٹ، گلے میں شوخ رنگ کی ٹائی۔ میں اس وضع قطع کو دیکھ کر کچھ حیران سا ہوا۔

شاہد صاحب کہنے لگے "عبادت صاحب! ان سے ملئے۔ یہ مشہور افسانہ نگار، ناول نویس اور ساقی کے مستقل لکھنے والے ہمارے دوست اور کرم فرما میاں ام اسلم ہیں۔ لاہور سے آئے ہیں۔"

میں نے اُن سے مصافحہ کیا، اور کہا آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ سے غائبانہ تعارف تو ایک زمانے سے تھا۔ آپ کی تحریریں پڑھی تھیں۔ خوش قسمتی کی بات ہے کہ آج نیاز بھی حاصل ہوگیا۔"

لیکن وہ بجائے میری طرف مخاطب ہونے کے شاہد احمد صاحب سے مخاطب ہوکر کہنے لگے۔ "لیکن مجھے ان سے مل کر بالکل خوشی نہیں ہوئی۔"

میں اُن کے اس عجیب وغریب انداز کو دیکھ کر اور اُن کی یہ بات سُن کر کچھ پریشان سا ہوا، اور چُپ ہوگیا۔ لیکن ام اسلم صاحب بولتے رہے۔

کہنے لگے "مجھے اِن سے مل کر خوشی اس لئے نہیں ہوئی کہ انہوں نے ادب لطیف کے سالنامے میں ایک طویل مضمون "اردو ادب ۴۲ء میں" لکھا ہے۔ اس میں میرے بارے میں یہ لکھا ہے کہ ام اسلم نے بہت اچھے افسانے لکھے ہیں۔ لیکن اُن کی زود نویسی اور بسیار نویسی انہیں لے ڈوبی ہے۔ صاحب! یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ یہ میرے مسلمان بھائی ہیں۔ انہوں نے اس مضمون میں ہندو سکھ لکھنے والوں کی تو خوب تعریف کی ہے لیکن میرے بارے میں یہ سب کچھ لکھ دیا ہے۔ بھلا مجھے اُن سے مل کر خوشی کس طرح ہوسکتی ہے؟"

میاں صاحب کی یہ بات سُن کر پہلے تو میں پریشان ہوا لیکن چند لمحوں میں اپنے آپ کو سنبھالا اور انہیں معصوم سمجھ کر اُن کی باتوں سے محظوظ ہونے لگا۔ ساتھ ہی اُن کی اس معصومیت اور سادہ لوحی پر مجھے پیار بھی آیا۔

چند منٹ میں ان کے پاس بیٹھا، اور اُن کی دلچسپ باتوں سے لُطف اندوز ہوتا رہا۔ پھر میاں صاحب سے اور دوسرے احباب سے اجازت لے کر کتب خانہ علم وادب سے باہر نکل آیا۔ شاہد صاحب بھی میرے ساتھ باہر آئے، بے اختیار ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگے "کہو بھئی کیسی رہی؟"

میں نے کہا "بہت مزہ آیا۔ ایک دلچسپ شخصیت سے آپ نے مُلاقات کروائی۔ ایسے لوگ آج کل کہاں ملتے ہیں؟" میاں صاحب کی معصومیت اور سادہ لوحی نے

مجھے بہت متاثر کیا ہے۔"

یہ اُردو کے مشہور افسانہ نگار اور ناول نویس میاں ام۔ اسلم سے میری پہلی مُلاقات تھی۔ چند روز دلّی میں قیام کرکے میاں صاحب تو لاہور واپس چلے گئے لیکن اُن کی دلچسپ باتیں احباب کی محفلوں کو زعفران زار بناتی رہیں۔

شاہد صاحب سے ایک روز پھر مُلاقات ہوئی تو دیر تک میاں صاحب کا ذکر رہا۔ وہ معذرت کے انداز میں یہ کہتے رہے کہ "میاں صاحب صاف گو اور زود رنج آدمی ضرور ہیں لیکن نہایت مخلص اور مہمان نواز دوست ہیں۔ میں جب بھی لاہور جاتا ہوں، اُن کے پاس ٹھہرتا ہوں۔ اگر کہیں اور ٹھہروں تو ناراض ہو جاتے ہیں۔ لاہور میں شاہی قلعہ کے پاس بارود خانے میں اُن کی بہت بڑی حویلی ہے۔ لاہور کے رئیسوں میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔ لکھنے پڑھنے کا شوق ہے۔ جب اُن کی تحریریں رسالوں میں نمایاں طور پر شائع ہوتی ہیں تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ساقی میں اُن کا افسانہ سب سے پہلے درج کیا جاتا ہے۔ اس لئے مجھ سے بہت خوش ہیں ویسے زود رنج بہت ہیں۔ دوستوں سے بھی ہمیشہ شکایتیں کرتے رہتے ہیں۔ کسی کو بخشتے نہیں۔ کوئی بات مزاج کے خلاف ہو جائے تو بس برس پڑتے ہیں۔ ویسے دل میں کوئی بات نہیں رکھتے۔"

میں نے کہا "ایسا آدمی تو اچھا ہوتا ہے۔ وہ آدمی ہی کیا جو بات کو دل میں رکھے۔ کینہ بُری چیز ہے۔ اختلاف کے برملا اظہار سے کینہ ختم ہو جاتا ہے۔ ویسے مجھے میاں صاحب بہت سادہ و معصوم نظر آئے۔ میں اُن کی باتوں سے بہت لُطف اندوز ہوا۔ ایسے لوگ آج کل کہاں ملتے ہیں"؟

میاں اسلم صاحب سے اس مُلاقات کو سال بھی نہیں گذرا تھا کہ پاکستان کا قیام عمل میں آگیا۔ دِلّی تباہ ہوگئی۔ میں لاہور آگیا۔ میاں صاحب کو میرے لاہور آنے کی خبر ملی تو وہ خود ایک دن میرے پاس اورینٹل کالج میں تشریف لائے۔ حال احوال پوچھا۔ میں نے اپنی بپتا بیان کی۔ بڑی ہمدردی کا اظہار کیا۔ اور کہا کہ "آپ میرے ہاں

قیام کیجئے"۔

میں نے معذرت کی اور کہا کہ "میرے کچھ عزیز لاہور میں ہیں۔ اُن کے ہاں میرا قیام ہے۔ فی الحال کوئی تکلیف نہیں ہے۔ میں کہیں بھی رہوں انشاءاللہ آپ سے ملاقاتیں ہوتی رہیں گی"۔

اس ملاقات کے چند روز بعد ہی انہوں نے ایک دن مجھے اور انتظار حسین کو کھانے پر بلایا۔ ہم لوگ بارود خانہ پہنچے۔ میاں اسلم کی حویلی کو تلاش کیا، کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔ اطلاع کروائی۔ میاں صاحب انتظار کر رہے تھے۔ فوراً باہر تشریف لے آئے۔ بڑی محبت سے ملے۔ اندر اپنے کمرے میں لے گئے۔ تھوڑی دیر حال احوال پوچھتے اور باتیں کرتے رہے۔ پھر نہ جانے اُن کے دل میں کیا لہر اُٹھی۔ کہنے لگے "میں نے آج ہی ایک افسانہ لکھا ہے۔ جی چاہتا ہے آپ کو سناؤں"۔

میں نے کہا "بسم اللہ! ضرور سنائیے"۔ اور دل میں کہا "ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر"۔

میاں صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں یہ افسانہ مزے لے لے کر سنایا۔ اور ہم سنتے رہے اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ افسانہ طویل تھا۔ کوئی ایک گھنٹے تک میاں صاحب یہ افسانہ سناتے رہے۔ کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ بھوک ہمیں ستاتی رہی۔

افسانہ ختم ہوا تو کھانا لگایا گیا۔ قسم قسم کے کھانے جو عام طور پر رئیسوں کے ہاں دعوتوں میں رکھے جاتے ہیں، ہمارے سامنے کھانے کی میز پر چُن دیئے گئے۔ پلاؤ، زردہ، قورمہ، کباب، فیرنی، قسم قسم کے پھل اور نہ جانے کیا کیا کچھ۔ ہم نے یہ مرغن کھانے کھائے، اور لیٹے اور پر غنودگی کا سا عالم طاری کیا۔ لیکن میاں صاحب کی دلچسپ باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان باتوں میں کچھ تو اپنے ذاتی غم کا بیان تھا، اور کچھ لوگوں کی بے اعتنائی اور بے نیازی کا تذکرہ ـــــ اور پھر چائے آ گئی۔ چائے پی کر غنودگی کا احساس کچھ کم ہوا۔

میاں صاحب نے کہا "میری زندگی میں بہت بڑا خلا ہے۔ میری کوئی اولاد نہیں۔ اللہ تعالےٰ نے سب کچھ دیا ہے لیکن اولاد کی نعمت سے مجھے محروم رکھا ہے۔ میں نے

ایک اپنی بہن کی بچی کو گود لے لیا تھا لیکن وہ بچی بھی اللہ کو پیاری ہوگئی۔ اس کی موت نے میری دُنیا اُجاڑ کر رکھ دی ہے۔ زندگی میں دُور دُور تک خلا ہی خلا نظر آتا ہے۔ میں نے اپنی ادبی مصروفیات سے اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی ہے۔ بس میں ہر وقت لکھتا رہتا ہوں۔ ہزارہا صفحات اب تک لکھ چکا ہوں۔ خاصی تعداد میں افسانے، مزاحیہ مضامین اور ناول میں نے لکھے ہیں۔ لوگوں نے ان تحریروں کو ہاتھوں ہاتھ لیا ہے لیکن لکھنے والے، خصوصاً ترقی پسند ادیب میری تحریروں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ ہمارے ہاں دھڑے بندی بہت ہے۔ میں کسی انجمن اور کسی تحریک سے وابستہ نہیں ہوں۔ اسی لئے لوگ مجھے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ میرے ناشروں نے بھی میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ ہزاروں کی تعداد میں میری کتابیں چھاپتے ہیں اور بیچتے ہیں لیکن خاطر خواہ معاوضہ نہیں دیتے۔ ڈنڈی مارتے ہیں۔"

غرض اس طرح کئی گھنٹے تک میاں صاحب ہم سے باتیں کرتے رہے۔ اُن کی باتیں سُن کر میرا دل بھر آیا اور میں نے انہیں دُکھی اور زخم خوردہ انسان محسوس کیا۔ لیکن میں کچھ بولا نہیں، اُن کی باتیں سُنتا رہا، اور اُن کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ انتظار حسین نے تو بالکل ہی چُپ سادھ لی، ایک لفظ اُن کی زبان سے نہیں نکلا۔

شام کو ہم لوگ میاں صاحب سے اجازت لے کر واپس آئے۔

محمد حسن عسکری صاحب اس زمانے میں اسلامیہ کالج کراچی میں انگریزی زبان وادب پڑھاتے تھے موسم گرما کی تعطیلات میں لاہور آجاتے تھے، اور زیادہ وقت میرے ساتھ گذارتے تھے۔

ایک دن وہ کہنے لگے "میاں اسلم صاحب نے ایک کتاب فسادات کے بارے میں رقص ابلیس کے نام سے لکھی تھی۔ میں نے اُن کی فرمائش پر اس کتاب پر مقدمہ لکھ دیا۔ میاں صاحب خوش ہوئے۔ لیکن اب انہیں یہ شکایت ہے کہ میں نے اپنے مضامین میں اس کتاب کا ذکر نہیں کیا۔ انہیں منانے کے لئے کسی دن اُن کے گھر چلیں گے۔"

میں نے کہا "ضرور چلیئے - میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا - میاں صاحب سے مجھے ہمدردی ہے - اُن کا دل ہاتھ میں لینا چاہیئے - وہ نہایت سادہ و معصوم آدمی ہیں"۔

چنانچہ ہم لوگ ایک دن وقت مقرر کر کے اُن کے ہاں پہنچے - اب کے بھی انہوں نے بڑی پُر تکلف دعوت کا اہتمام کیا - عمدہ عمدہ کھانے کھلائے، اور کھانے کے بعد عسکری صاحب پر برسنا اور انہیں آڑے ہاتھوں لینا شروع کیا۔

مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے "عسکری صاحب میرے مسلمان بھائی ہیں - انہوں نے رقص ابلیس پر مقدمہ لکھا - خیر، یہ مقدمہ تو انہیں لکھنا ہی چاہئے تھا کیونکہ یہ مسلمان اور پاکستانی ہیں - یہ کتاب بھی اسلامی اور پاکستانی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے - عسکری صاحب اسلامی اور پاکستانی ادب کے علم بردار ہیں - لیکن صاحب یہ عجیب بات ہے کہ انہوں نے اپنے مضامین میں اس کتاب کا کہیں ذکر نہیں کیا - یہ تو میرے خیال میں منافقت ہے - اسلام اور پاکستان دُشمنی ہے - سب سے زیادہ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے اس کتاب کو پسند کیا ہے، اس کی تعریف کی ہے - پھر یہ اس کا ذکر کیوں نہیں کرتے"۔

میں نے یہ سُن کر کہا "میاں صاحب! عسکری صاحب آئندہ اس کا ذکر اپنے مضامین میں ضرور کریں گے - انہیں کرنا بھی چاہیئے"۔

میاں صاحب کہنے لگے "نہیں صاحب! یہ ایسا نہیں کریں گے"۔

غرض کئی گھنٹے تک اس قسم کی جلی کٹی باتوں کا سلسلہ جاری رہا - عسکری صاحب ایک لفظ نہیں بولے - بس میاں صاحب کی باتیں سُنتے رہے - اور اس کے تلخ گھونٹ اپنے اندر اُتارتے رہے - میں میاں صاحب کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا تاکہ انہیں یہ احساس نہ ہو کہ اُن کا ہم نوا کوئی نہیں۔

شام کو ہم لوگ ان کی یہ جلی کٹی باتیں سُن کر واپس آئے۔

میاں صاحب کو حالات نے حد درجہ حساس اور جذباتی انسان بنا دیا تھا - نجی زندگی میں محرومی کے احساس کی وجہ سے وہ اس قسم کی باتیں زیادہ کرتے تھے - وہ

ہر ایک سے ناراض رہتے تھے شکوہ سنجی اُن کا مزاج بن گئی تھی ۔ اُداس رہتے تھے،
اور خوشی کے موقع پر بھی اُداس رہنے اور شکوہ و شکایت کے کچھ نہ کچھ پہلو نکال لیتے
تھے ۔ صاف گوئی اور بے باکی اُن کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ۔ اس
لئے وہ کسی کی پروا نہیں کرتے تھے ۔ جس خیال کی لہر دل میں اُٹھتی تھی اس کا برملا اظہار
کر دیتے تھے ۔ آزردہ رہنا اور افسردگی کی آرزو کرنا اُن کا مزاج بن گیا تھا ، اور وہ اپنی اس
نفسیاتی کیفیت کا اظہار اس طرح کرتے تھے کہ انسان شرمندہ ہو جاتا تھا ۔ لیکن اس
شرمندگی میں ہمدردی کی کیفیت ہمیشہ شامل ہو جاتی تھی ، اور وہ میاں صاحب کے
سامنے زبان نہیں کھول سکتا تھا ۔

عبدالسلام فروغی صاحب اُن کی کتابوں کے ناشر تھے ۔ اُنہوں نے میاں صاحب
کی بیشتر کتابیں شائع کیں اور لاکھوں روپے کمائے ، رئیس بن گئے ۔ چند سال تو میاں صاحب
کے ساتھ اُن کے تعلقات اچھے رہے لیکن پھر یہ تعلقات مجروح ہونا شروع ہوئے ۔
رفتہ رفتہ تعلقات میں اتنا کھنچاؤ پیدا ہو گیا کہ نوبت دشمنی تک پہنچی ۔ ناشر اور مصنف
کے تعلقات تو ہمارے ہاں ہمیشہ سے خراب ہی چلے آتے ہیں لیکن فروغی صاحب
اور میاں اسلم صاحب کے تعلقات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ یہ معاملہ دُور دُور
تک پہنچا ، اور میاں صاحب اپنے ناشر کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں زمین کا گز بن گئے ۔
برسوں اُن کا یہ معمول رہا کہ وہ صبح کو بارود خانے سے اشرف صبوحی اور مولانا اسمٰعیل پانی پتی
کے ساتھ نکلتے اور لاہور کی سڑکوں پر پیدل چل کر نہ جانے کہاں کہاں پہنچتے ۔ کئی کئی
میل پیدل چلتے ۔ وقار عظیم صاحب کے ہاں پہنچتے ، اس خیال سے کہ وہ پاکستان
رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری ہیں ، وہی اس معاملے میں حکم بن کر ان حالات کو سلجھا سکتے
ہیں ۔ لیکن وقار صاحب کیا کر سکتے تھے ۔ فروغی صاحب اُن کی بات مانتے نہیں
تھے ، اور حساب دینے کو تیار نہیں ہوتے تھے ۔ میاں صاحب نے اس کے بعد
میرے غریب خانے پر آنا شروع کیا ۔ بلا مبالغہ سیکڑوں بار میرے ہاں تشریف لائے
اور کہا کہ "میں وقار صاحب کو توجہ دلاؤں وہ سب کچھ کر سکتے ہیں" ۔ میں نے ذاتی طور پر

انہیں توجہ بھی دلائی لیکن پھر بھی کامیابی نہیں ہوئی ۔ وقار صاحب کے بس میں کچھ بھی نہیں تھا ۔ کوئی نتیجہ نہ نکلا ۔ میاں صاحب اور اشرف صبوحی صاحب لاہور کی سڑکیں ناپتے رہے ۔ لیکن فروغی صاحب کا کچھ نہ بگاڑ سکے ۔

آخری کوشش ہم لوگوں نے یہ کی کہ میاں صاحب کے عزیز دوست شاہد احمد دہلوی صاحب کو بیچ میں ڈالا ۔ طے یہ ہوا کہ میاں اسلم ، شاہد صاحب ، وقار صاحب اور میں فروغی صاحب کی جائے قیام پر جمع ہوں گے ۔ حساب وغیرہ کا تصفیہ بھی کیا جائے گا اور میاں صاحب اور فروغی صاحب کی صلح بھی کرائی جائے گی ۔ چنانچہ ہم لوگ مقررہ وقت پر فروغی صاحب کے ہاں محمد نگر میو روڈ پہنچے ۔ چائے پی ، اور پھر باتوں کا سلسلہ شروع ہوا ۔ لیکن فروغی صاحب اصل معاملے کو عجیب عجیب تاویلیں کر کے ٹالتے رہے ۔ اور بالآخر کوئی بات طے نہ ہو سکی ۔ شاہد صاحب اور وقار صاحب بھی ناکام ہو گئے ۔ میاں اسلم کو صدمہ ہوا ، اور یہ صدمہ انہیں زندگی بھر رہا ۔ فروغی صاحب اپنا تصنیف کردہ "مرغی خانہ" چھاپتے رہے اور میاں اسلم کو برا بھلا کہتے رہے ، اور یہ ظاہر کرتے رہے کہ "مرغی خانہ" نے انہیں رئیس اعظم بنا دیا ہے ۔

میاں اسلم لاہور کے رئیس تھے لیکن بہت سادہ زندگی بسر کرتے تھے ۔ اُن کی زندگی میں کوئی بے راہ روی نہیں تھی ۔ اللہ والے آدمی تھے ۔ انہوں نے کبھی مغربی لباس نہیں پہنا ۔ شلوار ، قمیص ، اس پر لمبا کوٹ ترکی ٹوپی ۔ بس وہ اسی لباس میں نظر آتے تھے ۔ البتہ اکثر اس لباس میں وہ شوخ رنگ کی ٹائی کا اضافہ کر لیتے تھے ۔ لوگوں کو ان کا شلوار کے ساتھ ٹائی لگانا عجیب معلوم ہوتا تھا ، لیکن کوئی کیا کر سکتا تھا ۔ یہ اُن کے شوق کا معاملہ تھا ۔ کبھی کبھی اس وضع قطع کے ساتھ انارکلی سے گذرتے تھے تو کوئی لڑکا اُن پر ایک دو فقرے بھی کس دیتا تھا ۔ میاں صاحب اس کے شکوہ سنج تھے ۔

ایک دن مجھ سے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہنے لگے "عبادت صاحب ! میرے صرف تین شوق ہیں ۔ شکار کھیلنا ، لکھنا ، اور لباس میں شلوار کے ساتھ شوخ ٹائی لگانا ۔ پتلون میں نہیں پہن سکتا ، اور ٹائی کو نہیں چھوڑ سکتا ۔ ٹائی مجھے اچھی لگتی ہے ـــــ لیکن

صاحب عجب زمانہ آیا ہے۔ میں اپنے لباس شلوار، قمیض کوٹ اور ترکی ٹوپی کے ساتھ ٹائی لگائے ہوئے انارکلی میں سے گذر رہا تھا کہ ایک لڑکے نے مجھے دیکھ کر کہا "لولو ہے لولو" اور بھاگ گیا۔ لوگ دیر تک ہنستے رہے۔ عبادت صاحب! مجھے لباس میں ایک ہی تو شوق ہے، اور وہ ہے ٹائی لگانے کا، لیکن اس قوم کے نوجوانوں کو کیا ہو گیا ہے۔ میں ٹائی لگا کر نکلتا ہوں تو مجھ پر آوازے کستے ہیں اور میرا مذاق اُڑاتے ہیں"۔

میاں صاحب کی یہ باتیں سُن کر مجھے بہت لطف آیا۔ اور میں نے اس صورتِ حال کو اس عہد کے نوجوانوں کی بداخلاقی اور بے راہ روی پر محمول کر کے میاں صاحب کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

اور کہا کہ "آپ ان لڑکوں کی پروا نہ کیا کیجیئے۔ یہ تو پٹری سے اُتر چکے ہیں۔ بے راہ رو اور بدتمیز ہو چکے ہیں۔ بزرگوں کا ادب نہیں کرتے۔ ان کے منہ نہ لگنا ہی بہتر ہے"۔

میاں صاحب نے اپنی ساری زندگی پڑھنے لکھنے میں گذار دی۔ اُنھوں نے ہزار ہا صفحات لکھے۔ بے شمار مختصر افسانوں، ناولوں اور مزاحیہ کتابوں کی تخلیق کی۔ اُن کی تحریریں لوگوں نے شوق سے پڑھی ہیں۔ اُن میں ادبیت ہے اور اُردو افسانے اور ناول کی روایت میں اُن کی ایک جگہ ہے۔ کوئی ادبی مؤرخ اُن کے ادبی کام کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ادبی تحریروں میں اسلام اور پاکستان سے دلچسپی کا اظہار بھی کیا ہے، اور قومی و ملی مسائل کو بھی اپنی ادبی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔ اور یہ اُن کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

میاں اسلم نہایت معصوم، سادہ، مرنجاں مرنج، مخلص، سچے، بیباک، نڈر، اور دلکش و دلآویز شخصیت کے انسان تھے۔ وہ مجھ سے کبھی کبھی ناراض بھی ہوتے تھے۔ لیکن مجھے اُن کے اس ناراض ہونے پر ہمیشہ پیار آتا تھا۔ اُنھوں

نے ریاست و امارت کے ماحول میں آنکھ کھولی لیکن ہمیشہ صوفیوں، ولیوں اور درویشوں کے بنائے ہوئے جذب وجنوں کے راستے پر چلے اور نئی منزلوں کی تلاش میں اس راستے پر نہ جانے کہاں کہاں نکل گئے۔

پروفیسر عزیز احمدؒ

پروفیسر عزیز احمد ایک تخلیقی فن کار اور اسلامیانِ ہند کی تاریخ اور تہذیب و ثقافت کے ایک بہت بڑے مزاج داں تھے۔ انہوں نے اُردو میں افسانے لکھے، ناول تخلیق کیئے، شاعری کی، تنقیدی مضامین لکھے، ان کو کتابی شکل میں شائع کیا، اور انگریزی میں اسلامیانِ ہند کے تہذیبی افکار پر کئی ایسی کتابیں تالیف کیں جن کی وجہ سے ہماری فکری تاریخ میں اُن کا نام ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ تخلیق اور تحقیق و تنقید کا ایسا حسین امتزاج کسی شخصیت کو ذرا مشکل ہی سے نصیب ہوتا ہے۔

عزیز احمد صاحب کو میں اپنی طالب علمی کے زمانے سے جانتا تھا۔ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے ذریعے سے اُن کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئیں، اور پھر اُن سے علمی موضوعات پر خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا جو اُن کی زندگی کے آخری لمحات تک جاری رہا۔ وہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے ہونہار طالب علم تھے۔ انہوں نے اس یونیورسٹی سے انگریزی ادبیات میں ام۔اے کی ڈگری لی، اور پھر لندن چلے گئے جہاں سے انہوں نے انگریزی میں بی۔اے آنرز کیا۔ واپس آکر وہ جامعہ عثمانیہ میں انگریزی کے شعبے میں ریڈر (ایسوسی ایٹ پروفیسر) ہوگئے۔ اس زمانے میں انہوں نے ریاست حیدرآباد دکن کی شہزادی دُرِّشہوار کے سیکرٹری کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ بابائے اُردو کی شفقت اور محبت کی

بدولت انہوں نے ترقی کی یہ منزلیں طے کیں۔ اس زمانے میں انہوں نے انجمن ترقی اُردو کے لئے ارسطو کی پوئیٹیکس کا اُردو میں ترجمہ کیا جو بوطیقا کے نام سے انجمن کی طرف سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ انہوں نے مولوی صاحب کی فرمائش پر گارساں دی تاسی کے خطبات اور مقدمات کے کچھ حصوں کے ترجمے بھی کئے جو پہلے رسالۂ اُردو، میں اور اس کے بعد انجمن کی طرف سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ اسی زمانے میں اُن کے ناول شبنم ہوس اور مرمر اور خون بھی شائع ہوئے اور وہ ادبی رسالوں میں افسانے اور مضامین بھی لکھتے رہے۔

میں نے جب پی ایچ ڈی کے لئے اُردو تنقید پر کام شروع کیا، تو اُن سے علمی استفادے کی غرض سے خط و کتابت کی۔ اور اُنہوں نے تنقید کے مختلف پہلوؤں پر مجھے مفصل خط لکھے جن کی وجہ سے مجھے تنقید کے مختلف مسائل کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی۔

قیام پاکستان سے قبل وہ قاسم رضوی صاحب مرحوم کی مجلس اتحاد المسلمین میں بھی رضا کار کی حیثیت سے شامل ہوئے، اور جذبے اور جوش کے ساتھ انہوں نے اس تحریک کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ جب حیدر آباد دکن پر ہندوستان نے حملہ کیا تو اس وقت وہ حیدر آباد میں موجود تھے۔ اُس کے بعد وہ پاکستان آئے اور حکومت پاکستان کے محکمۂ اطلاعات میں ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ کئی سال انہوں نے اس سرکاری ملازمت میں گذارے۔ اُن کا قیام اس زمانے میں زیادہ تر کراچی میں رہا۔ یہیں اُن سے میری پہلی ملاقات ہوئی، اور میں اُن کی دلکش شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔

عزیز احمد صاحب خوبصورت آدمی تھے۔ دراز قد، چھریرا جسم، سرخ سفید رنگ، کتابی چہرہ، اس پر سنہرے رنگ کے فریم کی عینک، چہرے پر مسکراہٹوں کی شفق، گفتگو میں شہد و شکر کی آمیزش، نیچی نظروں میں شرم و حیا کا رنگ، اور تہذیب و شائستگی کا آہنگ —— ان تمام چیزوں کے متوازن امتزاج کی وجہ سے عزیز احمد صاحب

کی شخصیت میں مجھے قوس قزح کی سی دلکشی اور دلآویزی نظر آئی۔
اور پھر اُن کے اسی انداز دلبری اور طرز دلربائی کی وجہ سے میری اُن سے دوستی ہو گئی۔

اس زمانے میں عزیز احمد صاحب اپنے سرکاری کام کے سلسلے میں لاہور بھی آتے تھے۔ لاہور میں اُن کا خاصا وقت میرے ساتھ اورینٹل کالج میں گذرتا تھا۔ اُن سے کسی حد تک بے تکلفی بھی ہو گئی تھی۔ اس لیئے وہ لاہور میں زیادہ وقت میرے ساتھ گذارتے تھے۔ اِن ملاقاتوں میں ہم لوگ زیادہ تر علمی ادبی موضوعات پر باتیں کرتے تھے۔ نئی کتابوں کا ذکر ہوتا تھا۔ نئے رسالوں میں شائع ہونے والی تخلیقات زیر بحث آتی تھیں۔ مستقبل میں کام کرنے کے منصوبے بھی بیان کئے جاتے تھے۔ اور ان تمام باتوں سے یہ بات واضح ہوتی تھی کہ عزیز احمد دفتری آدمی کم اور علمی اور ادبی انسان زیادہ ہیں۔

شاید یہی وجہ ہے کہ عزیز احمد ایک کامیاب افسر نہ بن سکے۔ ویسے دفتری کام انہیں خوب آتا تھا۔ وہ ذہین بھی بلا کے تھے۔ معاملات کی تہہ تک پہنچنے میں بھی اُنہیں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ وہ فیصلے بھی صحیح کرتے تھے۔ لیکن اُن کے مزاج میں ایک عجیب طرح کا تلوّن تھا۔ کسی پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔ زود رنج بھی تھے۔ اس لیئے اُن کے ساتھ کام کرنے والے افسر اور عملے کے لوگ اُن کے ہمیشہ شکوہ سنج رہتے تھے۔ اُن کے دفتر کی فضا میں ایک عجب طرح کا تناؤ سا رہتا تھا، اور کشیدگی کی ایک فضا سی چھائی رہتی تھی۔ محمد حسن عسکری صاحب نے کچھ عرصے اُن کے ساتھ کام کیا۔ وہ اُن کے دوست بھی تھے لیکن بہت جلد وہ اُن کے اس رویّے سے بیزار ہو گئے۔ بالآخر انہوں نے اس ملازمت کو خیرباد کہا۔ سید محمد جعفری صاحب بھی اُن کے ساتھ کچھ عرصے کام کرتے رہے لیکن وہ بھی اس فضا میں خوش نہیں رہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس کی پروا نہیں کرتے تھے، اور اُن کے مزاج کی مزاحیہ کیفیت اس فضا سے کوئی منفی اثر قبول نہیں کرتی تھی۔ لیکن

سید امجد علی صاحب صد درجہ جذباتی اور زود رنج تھے۔ اس لئے عزیز احمد اور اُن کے درمیان خاصے عرصے تک ایک میدان کارزار گرم رہا۔ اور بالآخر نوبت مقدمے بازی تک پہنچی، جس میں امجد صاحب کامیاب ہوئے اور عزیز احمد صاحب کو پشیمان اور پریشان ہونا پڑا۔

میں نے ایک دن عزیز احمد صاحب سے پوچھا کہ "یہ فضا کیوں پیدا ہوئی۔ اور ایسے اچھے اچھے دوست آپ سے کیوں نالاں ہوئے؟"

عزیز صاحب نے کہا "بات یہ ہے کہ یہ لوگ میرے خلاف ہیں، اور مجھے یہاں سے ہٹانا چاہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں سازش کا ماحول پیدا ہو گیا ہے"۔

میں نے کہا اس ماحول میں دفتری کام خاطر خواہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کو اس مسموم فضا کو کسی طرح ختم کرنا چاہیئے۔ اس کا اثر آپ کی صحت پر بھی خراب ہوگا۔

عزیز احمد نے میرے اس خیال سے اتفاق کیا لیکن حالات اتنے خراب ہو چکے تھے کہ اُن کو ٹھیک کرنا اور راہ راست پر لانا اُن کے بس کی بات نہیں تھی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ بالآخر انہیں دفتر کو چھوڑنا پڑا اور وہ ایک زمانے تک خاصے پریشان رہے۔

بات یہ ہے کہ عزیز احمد نے ریاستی ماحول میں پرورش پائی تھی۔ اس ماحول میں احساسِ تحفظ کی وجہ سے جو سازشیں ہوتی ہیں، وہ اُن کے مزاج کا جُزبن گئی تھیں، اور اُن سے چھٹکارا حاصل کرنا اُن کے بس میں نہیں تھا۔ پاکستان کا ماحول حیدر آباد کے ماحول سے مختلف تھا۔ یہاں انگریزوں کی قائم کی ہوئی روایت دفتری ماحول میں عام تھی۔ اس میں آزادی کا تصور تھا، برابری کا احساس تھا۔ عزیز احمد اس سے مطابقت پیدا نہ کرسکے، اس لئے اُن کے عزیز دوست تک اُن سے بیزار ہو گئے۔ اور انہوں نے دشمنی پر کمر باندھ لی۔

چنانچہ مجبوراً وہ حکومت پاکستان کی ملازمت کو چھوڑ کر انگلستان چلے گئے، اور لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں اُردو اور مطالعۂ پاکستان

کے اُستاد ہوگئے۔ اس سے قبل اس جگہ پر ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی۔ اور ڈاکٹر خورشید الاسلام کام کر چکے تھے۔ عزیز احمد نے تین سال یہاں کام کیا۔ تدریس و تحقیق کا یہ کام اُن کے مزاج کے ساتھ مطابقت رکھتا تھا۔ وہ قابل آدمی تھے۔ انگریزی اور اُردو ادبیات پر اُن کی گہری نظر تھی۔ ہندوستان کی تاریخ کا بھی انہوں نے مطالعہ کیا تھا۔ وہ کئی زبانیں جانتے تھے۔ اُردو تو اُن کی مادری زبان تھی۔ انگریزی کے وہ فاضل تھے۔ فرانسیسی انہیں اچھی آتی تھی۔ جرمن اور اطالوی زبانیں بھی جانتے تھے۔ اس لیئے بہت جلد انہوں نے اسکول میں اپنے لیئے ایک منفرد مقام پیدا کرلیا۔ لندن یونیورسٹی کے بڑے بڑے پروفیسر اُن کی عزّت کرتے تھے۔ آکسفورڈ، کیمبرج اور انگلستان کی دوسری یونیورسٹیوں میں اُن کی شہرت تھی۔ اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں اُردو کے اُستاد رالف رسل بھی اُن سے متاثر تھے۔ کینیڈا اور امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں میں بھی وہ برِعظیم پاکستان و ہند کی تاریخ و تہذیب اور اُردو زبان و ادب کے ماہر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔

اسی شہرت اور ناموری کی بدولت جب وہ اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز کی ملازمت سے، اپنی ملازمت کی مُدّت پوری کرکے، سبکدوش ہوئے تو انہیں ٹورنٹو یونیورسٹی میں اسلامیات کی پروفیسر شپ مِل گئی۔ اور اُن کی خالی جگہ پر لندن یونیورسٹی میں میرا تقرر ہوا۔

میں جب لندن پہنچا تو وہ ٹورنٹو جا چکے تھے۔ لیکن تعطیلات میں اکثر لندن آتے تھے اور برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں ہندوستان کی اسلامی تہذیب پر اپنی ریسرچ کا کام کرتے تھے، اس زمانے میں اُن سے طویل مُلاقاتیں ہوتی تھیں، اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی تھی کہ وہ اسلامیانِ ہند کی تہذیب و ثقافت اور فکر و فلسفہ پر قابل قدر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ ٹورنٹو کے دوران قیام میں اس موضوع پر اُن کی تین چار کتابیں شائع ہوئیں، اور خاصی تعداد میں اُن کے مقالے بھی مختلف ریسرچ جرنلز میں شائع ہوئے۔ علمی اعتبار سے ٹورنٹو کا قیام ان کی زندگی کا بہترین زمانہ تھا۔

لندن کے دوران قیام میں میں اپنے تحقیقی کاموں کے سلسلے میں زیادہ وقت برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں گذارتا تھا۔ عزیز احمد صاحب سے اکثر یہاں میری مُلاقاتیں ہوتی تھیں۔ جب بھی ٹورنٹو میں تعطیلات ہوتی تھیں تو وہ لندن آجاتے تھے اور یہاں سے فرانس، جرمنی اور اٹلی بھی جاتے تھے۔ اُن کا سفر اس زمانے میں تفریحی بالکل نہیں ہوتا تھا۔ وہ صرف علمی اور تحقیقی کام کے سلسلے میں یورپ کے مختلف ممالک میں جاتے تھے۔ لیکن اُن کا زیادہ وقت لندن میں گذرتا تھا۔ لندن سے وہ بہت مانوس تھے اور اس شہر میں ہمیشہ خوش رہتے تھے۔ انگلستان کے تعلیمی نظام کی تعریف کرتے تھے، اور اس شہر میں اپنے قیام کے زمانے کو بڑی حسرت سے یاد کرتے تھے۔

جب ہم لوگ برٹش میوزیم میں کام کرتے کرتے تھک جاتے تھے تو عزیز احمدؔ مجھے رِسیتوران میں لے جاتے تھے۔ وہاں ہم لوگ چائے اور کافی پی کر اپنے آپ کو تازہ دم کرتے تھے، اور مختلف علمی اور ادبی موضوعات پر باتیں کرتے تھے۔

ایک دن مجھ سے کہنے لگے "میں لندن سے چلا تو گیا۔ ٹورنٹو میں بھی حالات اچھے ہیں، کام بھی وہاں خاصا کر رہا ہوں۔ لیکن لندن کی سی بات وہاں نہیں ہے۔"

میں نے کہا "لندن کی کیا بات ہے! یہاں کے تعلیمی نظام میں جو بات ہے، وہ شاید دُنیا میں کہیں نہیں ہے۔ اُستادوں کو یہاں جو آزادی ہے، اور اُن میں کام کرنے کی جو دُھن اور لگن ہے وہ میں نے کہیں اور نہیں دیکھی۔ پھر یہاں ایسی لائبریریاں ہیں جن میں ہم لوگوں کے لئے کبھی ختم نہ ہونے والے خزانے ہیں۔ اسی لئے تو یہاں جی لگتا ہے اور اس سرزمین پر زندگی بسر کرنے کو جی چاہتا ہے ؎

ہر کجا چشمہٗ نور شیریں
مردم و مُرغ و مور گِرد آیند"

عزیز احمدؔ صاحب کہنے لگے "واقعی یہاں بڑا سرمایہ ہے۔ میں تو لندن کے دورانِ قیام میں اِن خزانوں سے زیادہ استفادہ نہ کر سکا۔ کیونکہ کچھ تخلیقی کاموں میں مصروف رہا۔ ناول وغیرہ لکھتا رہا۔ آپ ان خزانوں کو کھنگا لیئے۔ آپ کے پاس بھی وقت

خاص ہے۔"

میں نے کہا میں انشاءاللہ ضرور آپ کی ہدایات پر عمل کروں گا۔ کاش حکومت پاکستان بھی اس معاملے میں ہماری مدد کرے۔ لیکن حکومت کے لوگوں کو ان معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں۔"

غرض جب بھی عزیز احمد صاحب سے برٹش میوزیم میں ملاقات ہوتی تھی تو ہم لوگ گھنٹوں اس طرح کی باتیں کرتے تھے۔ اور کام کرنے کے منصوبے بناتے تھے۔

عزیز صاحب کسی نہ کسی ادارے سے ریسرچ گرانٹ لے کر سال میں دو تین دفعہ لندن ضرور آجاتے تھے، اور مجھے تحقیقی کاموں کے سلسلے میں مفید مشورے دیتے تھے۔

عزیز احمد صاحب کا مزاج علمی تھا۔ لندن کے دوران قیام میں انہوں نے تاریخی اور تحقیقی پہلوؤں کی طرف توجہ دی، اور اس کے بہت اچھے نتائج برآمد ہوئے۔ اسلامیان ہند کی تہذیب و ثقافت پر انہوں نے سنجیدگی کے ساتھ کام شروع کیا، اور ٹورنٹو یونیورسٹی میں رہ کر ان کاموں کو سمیٹا، اور انگریزی زبان میں اس موضوع پر ایسی کتابیں شائع کیں جو ہمیشہ یادگار رہیں گی۔

ٹورنٹو سے وہ اکثر بے تکلفی سے مجھے خط لکھتے رہتے تھے اور جن کتابوں اور رسالوں کی انہیں ضرورت ہوتی تھی وہ مجھ سے منگواتے رہتے تھے۔ لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کا ریسرچ جرنل انہیں بہت پسند تھا کیونکہ اس میں اعلیٰ معیار کے مقالات شائع ہوتے تھے۔ چنانچہ اکثر مجھے اس کی فراہمی کے بارے میں لکھتے رہتے تھے، اور میں ہمیشہ ان کے ارشادات کی تعمیل کرتا تھا۔ ایک دفعہ ٹورنٹو سے ایک خط میں انہوں نے مجھے لکھا:-

"مکرمی و محبی عبادت صاحب!

اُمید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے، اور لندن میں سردی یہاں سے کم ہوگی۔ آپ کو ایک خاص غرض سے سلام روستائی پیش کر رہا ہوں۔

رالف رسل مجھے B.S.O.A.S کے پرچے دو سال سے باقاعدہ بھیجا کرتے تھے۔ اب وہ ہندوستان میں ہیں، اور نہیں بھیج سکتے۔ اگر میں خود خریدوں تو مجھے فی پرچہ تین پونڈ دینے پڑیں گے۔ لیکن جو لوگ S.O.A.S کے اسٹاف کے ممبر ہیں، انہیں رعایتی قیمت پر یعنی سات شلنگ چھ پنس میں ملتا ہے۔

میں نہایت ممنون ہوں گا اگر اس تعلیمی سال کے تین پرچے مجھے روانہ کر سکیں۔ ان میں سے ایک نومبر یا دسمبر ۱۹۶۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ایک فروری یا مارچ ۱۹۶۵ء میں شائع ہوگا، اور ایک آئندہ ٹرم یعنی جون تک شائع ہو جائے گا۔ ان کا مجھے سخت انتظار ہے اور بڑی سخت ضرورت ہے۔ اس لئے میں دو پونڈ دس شلنگ کا چک ارسال کر رہا ہوں تا کہ آپ بُک پوسٹ اور سرفیس میل سے نومبر، دسمبر ۶۴ء والا پرچہ تو فوراً اور دوسرے پرچے وقت اشاعت بھیج سکیں۔ میں آپ کا انتہا درجہ ممنون ہوں گا۔

آپ کی اپنی کتابوں کا وعدہ ایسا ہے جس پر میں اصرار نہیں کروں گا لیکن لندن میں اپنی تحقیقات پر آپ نے جو نئی تصنیفیں لکھی ہیں وہ اگر آپ کے ناشر مجھے قیمتاً بھیج سکیں تو میں احسان مند ہوں گا۔

اور سب خیریت ہے۔ ریاض صاحب کو سلام

مخلص

عزیز احمد

ایک اور خط میں انہوں نے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز کے بلیٹن کے بارے میں مجھے پھر یاد دہانی کرائی، اور لکھا ہے

"مکرمی و محبی عبادت صاحب، السلام علیکم

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

گذشتہ سال کے بلیٹن کے پرچوں میں سے دو، جو آپ نے روانہ فرمائے تھے، مجھے مل گئے۔ لیکن تیسرا پرچہ جو گذشتہ مئی یا جون کو شائع ہوا ہوگا، نہیں ملا۔ اس کے لئے اب تک چشم براہ ہوں۔ جو رقم میں نے روانہ کی تھی وہ غالباً اس کے لیے کافی ہوگی۔ اگر نہ ہو تو مزید رقم روانہ کردوں تاکہ میرے پاس بلیٹن کی فائل مکمل رہے۔

اس سال گرمیوں کی چھٹیوں میں پھر لندن آنے کا قصد ہے۔ معلوم نہیں آپ کا قیام مزید ایک سال رہے گا یا نہیں۔ بہرحال جواب سے ضرور ممنون فرمائیے۔

کمترین
عزیز احمد

مکرر:

رالف رسل غالباً لندن واپس پہنچ گئے ہوں گے۔ اگر پہنچ گئے ہوں تو اپنے جواب میں اس کی بھی اطلاع دیجئے تاکہ میں انہیں بھی لکھ سکوں"۔

یہ دونوں خط یہاں نقل کرنے کا مقصد اس بات کو واضح کرنا ہے کہ اس زمانے میں عزیز صاحب کو اپنے کام کے لئے مواد جمع کرنے کی کیسی دُھن اور لگن تھی۔ اور وہ اس کو فراہم کرنے میں کس طرح چاق و چوبند رہتے تھے ـــ اس کے علاوہ ان کے خطوں سے اُن کے علمی مزاج اور تحقیقی مذاق کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

اس زمانے میں عزیز احمد صاحب اپنے علمی کاموں میں اتنا زیادہ مصروف رہے کہ انہوں نے اپنی صحت کا بھی خیال نہیں رکھا، اور ان تھک محنت کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی صحت جواب دینے لگی ۔ لیکن اُنہوں نے اس کا کوئی خیال نہیں کیا۔

ایک دفعہ وہ موسم گرما کی تعطیلات میں لندن آئے اور مجھ سے مُلاقات ہوئی تو میں نے یہ محسوس کیا کہ اُن کا رنگ زرد ہے، اور وہ پوری طرح صحت مند نہیں ہیں ۔ لیکن وہ دن دن بھر کام کرتے رہے۔

ملاقات ہوئی تو میں نے اُن سے پوچھا "آپ کا قیام کہاں ہے؟"

کہنے لگے "MUSWEL HILL کے علاقے میں ایک لینڈ لیڈی میری جاننے والی ہے۔ اس کے ہاں ٹھہر گیا ہوں"۔

میں نے پوچھا "وہاں آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"

کہنے لگے "نہیں، ہر طرح کا آرام ہے۔ دن بھر تو میں باہر رہتا ہوں۔ رات کو جا کر سو جاتا ہوں"۔

میں نے کہا "بہتر یہ ہوتا کہ آپ بیگم صاحبہ کے ساتھ آتے اور میرے ہاں ٹھہرتے۔ کیونکہ آپ کی جو دیکھ بھال میرے ہاں ہو سکتی ہے وہ انگریزوں کے ماحول میں نہیں ہو سکتی۔ وہاں تنہائی جان لیوا ہوتی ہے۔ طبیعت ناساز ہو جائے تو کوئی پانی تک دینے والا بھی نہیں ہوتا۔ اور آپ عمر کے جس حصے میں ہیں، اور جس طرح کا خون جلانے والا کام آپ کرتے ہیں۔ اس میں صحت کس کی ٹھیک رہتی ہے۔ کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے"۔

عزیز صاحب کہنے لگے "آپ کی بات ٹھیک ہے۔ آئندہ سے ان باتوں کا خیال رکھوں گا۔ اب تو لندن میں صرف چند روز کا قیام ہے۔ اس کے بعد واپس ٹورنٹو چلا جاؤں گا"۔

اس گفتگو کے بعد تین چار دن تک عزیز احمد صاحب، نہ تو اسکول میں آئے نہ برٹش میوزیم میں۔ میں یہ دیکھ کر پریشان ہوا، اور میرا ماتھا ٹھنکا۔ خیال آیا کہ ضرور خدانخواستہ ان کی طبیعت ناساز ہے۔

چوتھے دن صبح صبح چھ بجے سے قبل ان کا ٹیلی فون آیا۔ لندن میں صبح کو اتنی جلدی کوئی فون نہیں کرتا۔ گھنٹی بجی، اور میں نے فون اٹھایا تو عزیز صاحب کی بہت نحیف سی آواز آئی۔ وہ کہہ رہے تھے "عبادت صاحب! میں بیمار ہو گیا ہوں۔ اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو گیا ہے۔ آواز بھی کانپ رہی ہے۔ میں ہائی گیٹ کے قریب ٹھہرا ہوا ہوں۔ آپ فوراً آ جائیے"۔

میں فوراً اپنی جائے قیام Hambsteed سے ہائی گیٹ روانہ ہوا۔ ساتھ بجے وہاں پہنچ گیا۔ گھنٹی بجائی۔ لینڈ لیڈی نے دروازہ کھولا۔ میں اندر گیا۔ عزیز احمد صاحب کے کمرے میں پہنچا۔ وہ واقعی بہت بیمار تھے۔

کہنے لگے "میں نے پرسوں رات کو کوئی غلط چیز کھالی۔ اس کی وجہ سے میری طبیعت خراب ہوگئی۔ رات بھر معدے میں تکلیف رہی۔ دست آتے رہے۔ اب تو مجھ سے بات بھی نہیں کی جاتی۔"

میں فوراً ڈاکٹر کے پاس گیا۔ اُس کو ساتھ لے کر آیا۔ عزیز صاحب کو دکھایا۔ اس نے کہا اُن کے جسم میں سے سارا پانی نکل گیا ہے۔ میں دوائیں لکھتا ہوں۔ میں بازار گیا دوائیں لے کے آیا۔ دن بھر اُن کے پاس رہا، تیمارداری کی۔ شام تک اُن کی طبیعت خاصی ٹھیک ہوگئی تو میں گھر واپس آیا۔

عزیز صاحب چند روز میں جب چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تو میں انہیں اپنے ہاں لے آیا، اور چند روز کے بعد انہیں ٹورنٹو رخصت کیا۔

ٹورنٹو پہنچ کر اُنھوں نے مجھے لکھا:

"مکرمی و محبی عبادت صاحب!

آج خیریت سے نیویارک پہنچ گیا۔ اور آج رات ریل سے ٹورنٹو پہنچ جاؤں گا۔ میں آپ کی عنایت اور مہربانی کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ کہ میں نے اپنی علالت کے زمانے میں بار بار تکلیف دی، اور آپ نے ہمیشہ مدد کی۔ اور کئی بار زحمت فرمائی۔

اگر کبھی کوئی کام میرے لائق ہو تو تحریر فرمائیے۔

میری طبیعت جہاز پر بہت ٹھیک ہوگئی، اور اُمید ہے کہ چند روز میں مکمل صحت ہو جائے گی۔

میری طرف سے رالف کو سلام کہہ دیجیے۔ سعید صاحب کا پتہ

میرے پاس گم ہو گیا ہے۔ ساتھ کا خط انہیں پہنچا دیجیے گا۔

کمترین

عزیز احمد

اس خط پر تاریخ نہیں تھی لیکن لفافے پر جو مہر تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ خط ۲۴ رجون ۱۹۶۴ء کو ٹورنٹو سے پوسٹ ہوا۔ اس کے بعد وہ ٹھیک ہو گئے۔ صحت بحال ہو گئی۔ لیکن دراصل یہیں سے ان کی علالت کی ابتدا ہوئی۔ کئی سال تک انہیں اس کا علم نہ ہو سکا۔

اگلے سال جون ۱۹۶۵ء میں انہوں نے پاکستان جانے کا پروگرام بنایا۔ اور مجھے لکھا:

"مکرمی و محبی عبادت صاحب السلام علیکم

میری بیوی اور میں دو مہینے کے لئے چھٹی لے کر پاکستان جا رہے ہیں تاکہ اپنے وظیفے اور دیگر امور کی کارروائیوں کی تکمیل کر سکیں۔ اور اپنی لڑکی اور نواسیوں کو دیکھ آئیں۔ جاتے ہوئے ہم لندن سے گذریں گے۔ لیکن دو ایک روز سے زیادہ لندن میں ٹھہر نہ سکیں گے۔ لندن میں مجھے صرف اپنی کتاب کی رائلٹی کے پیسے لینا ہیں تاکہ جاتے جاتے ایک موٹر لے جا سکیں، اور ہماری آمد و رفت کا کچھ خرچ نکل آئے۔

اُمید ہے کہ اس قلیل عرصے میں بھی آپ سے ایک آدھ ملاقات ہو جائے گی۔ ۱۵ ستمبر سے پہلے میں واپس آجاؤں گا۔ بیوی کچھ عرصے پاکستان میں رہیں گی کیونکہ ہم لوگ آٹھ سال کے بعد جا رہے ہیں۔ ہمارا ارادہ جولائی کے اوائل میں جانے کا ہے۔

آپ نے میری خدمات سے متعلق جو الفاظ لکھے ہیں ان کے لئے بہت مشکور ہوں۔ کاش میں اُن کا مستحق ہوتا!

میری صحت پہلے سے ٹھیک ہے۔ اُمید ہے کہ آپ اور آپ کے گھر

کے سب لوگ ٹھیک ہوں گے۔

مخلص

عزیز احمد

پاکستان جاتے ہوئے وہ چند روز لندن میں ٹھہرے۔ اُن سے اس مختصر قیام کے دوران کئی ملاقاتیں ہوئیں اور حسبِ معمول علمی ادبی موضوعات پر تبادلۂ خیال ہوا۔ انہوں نے اپنے علمی کاموں کی تفصیل بتائی اور میں جو کام کر رہا تھا اس کی تفصیل سُنی۔ بہت خوش ہوئے۔

کہنے لگے "لندن میں آپ کے تین سال غالباً آئندہ سال پورے ہو جائیں گے۔ آپ اس کے بعد ٹورنٹو کیوں نہیں آجاتے۔ مجھے تقویت رہے گی"۔

میں نے کہا "عزیز صاحب! میں نے یہ تین سال بھی نہ جانے کس طرح گذارے ہیں۔ علمی ادبی کام کے سہارے زندہ رہا۔ مجھے جلا وطنی کی زندگی پسند نہیں ہے۔ میں تو اپنے وطن میں رہنا چاہتا ہوں۔ جس طرح کا کام میں کرتا ہوں، اس کے لئے پاکستان میں مستقل قیام ضروری ہے۔ میں ایک دو سال لندن میں اور رہوں گا۔ یہاں سے اپنے کام کی چیزیں حاصل کر کے لاہور جاؤں گا، اور وہاں اطمینان سے بیٹھ کر کام کروں گا۔ میرے پاس امریکہ کی دو تین یونیورسٹیوں کی طرف سے "آفر" آئے ہیں، لیکن میں نے معذرت کر دی ہے"۔

عزیز احمد صاحب چند روز لندن میں قیام کر کے پاکستان چلے گئے، اور دو تین مہینے کے بعد ٹورنٹو واپس آ گئے۔ میں ایک سال کے بعد لاہور واپس آگیا۔

لاہور میں مجھے اُردو کی پروفیسر شپ مل گئی۔ اورینٹل کالج کا پرنسپل بھی بنا دیا گیا، اس کے ساتھ شعبۂ تاریخ ادبیات کی ڈائرکٹری کے فرائض بھی انجام دینے پڑے۔ ڈائرکٹر کی حیثیت سے میں نے اسلامیان ہند کی ادبی تاریخ پر مقدمے کی ایک جلد مرتب کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس سلسلے میں دوسرے اسکالروں کے ساتھ ساتھ عزیز احمد صاحب کو بھی ایک باب لکھنے کے لئے درخواست کی۔ کیونکہ میرے خیال

میں مسلمانوں کی تہذیب پر اُن سے بہتر کوئی اور نہیں لکھ سکتا تھا۔

لیکن اُن کے جواب نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ اس خط میں انہوں نے پہلی بار اپنی مہلک بیماری کی اطلاع دی۔ انہوں نے مجھے لکھا:

"مکرمی و محبی عبادت صاحب السلام علیکم

گرامی نامہ ملا جس میں آپ نے پاکستان و ہند کے مسلمانوں کی ادبی تاریخ کے ایک باب کے لکھنے کی فرمائش تھی۔ میں ضرور اس کی تعمیل کرتا لیکن علیل ہوں۔ مجھے کینسر ہے۔ اس لئے معافی کا خواستگار ہوں۔

لاہور میں آپ کی مہمان نوازی اور آپ کی اس تکلیف کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے بہت سے پرانے دوستوں سے دوبارہ ملاقات کرادی۔ اب شاید ہی اس زندگی میں اُن سے ملنا ہو!

آپ کی عنایات بہت یاد آتی ہیں۔

کمترین

عزیز احمد

یہ خط پڑھ کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ بہت پریشان ہوا۔ اُن کا دل رکھنے اور حوصلہ بڑھانے کے لئے پے در پے کئی خط لکھے۔ لیکن جب انسان کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کینسر کا مریض ہے تو ظاہر ہے کہ اس میں حوصلہ اور ولولہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟۔ عزیز احمد صاحب روز بروز بجھتے گئے۔

۱۰ اگست ۱۹۷۶ء کو اُن کا جو خط مجھے ملا، وہ بہت ہی تشویش ناک اور پریشان کُن تھا۔ اس کے ایک ایک لفظ سے حسرت ٹپکتی تھی۔ انہوں نے لکھا:۔

برادر عزیز جناب عبادت بریلوی صاحب، السلام علیکم

کئی مہینے ہوئے آپ کا گرامی نامہ ملا تھا۔ اس کے بعد میرا تیسرا آپریشن Colostomy کا ہوا جس میں نیچے کی آنتیں نکال دی گئیں، اور اجابت کے لئے پیٹ پر تھیلی لگانی پڑتی ہے۔ بہرحال جب تک زندگی باقی ہے

جی رہا ہوں۔ خدا اس ارادے کو پورا کرے کہ آخری وقت تک کام کرتا رہوں۔

اخبار میں پڑھا تھا کہ اورینٹل کالج کو یونیورسٹی بنا دیا گیا ہے۔ خدا کرے آپ کو اس کا وائس چانسلر بنایا گیا ہو مگر وہاں کی سیاسیات سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔

رالف لاہور پہنچ گئے ہوں تو انہیں میرا اسلام پہنچا دیجئے۔

آپ کی ضیافت کی بدولت بہت سے پرانے دوستوں خصوصاً احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین اور ابن انشا سے اتنے سال بعد مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ ان سب کو میرا اسلام پہنچا دیجئے۔ اور یہ پیغام کہ اگر زندہ بچ گیا تو شاید پھر ملاقات ہو، ورنہ حفیظ ہوشیار پوری کا یہ شعر بے ساختہ یاد آجاتا ہے ؂

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

مخلص

عزیز احمدؒ

اس خط نے مجھے مایوسی کے اندھیروں میں گم کر دیا۔ ایسی کیفیت طاری ہوئی جس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

چند مہینے بعد یہ خبر ملی کہ عزیز احمدؒ صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ میرے لئے یہ ایک بہت بڑا صدمہ تھا۔ اس لئے کہ میرا ایک مخلص دوست، اردو کا ایک مشہور افسانہ نگار، ایک نامور ناول نویس، عالمی شہرت کا ایک مورخ، ایک بڑا عالم اور اسلامی تہذیب کا ایک اہم مزاج داں اپنے بے شمار چاہنے والوں کو اداس اور سوگوار چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کی مغفرت کرے!

عزیز احمد صاحب بڑی ہی دلآویز اور دلفریب شخصیت کے مالک تھے۔ وہ خوش شکل تھے۔ جامہ زیب تھے، خوش گفتار تھے۔ مہذب اور شائستہ تھے۔ اُن کے مزاج میں بڑی عاجزی اور انکساری تھی۔ کم آمیز ضرور تھے لیکن احباب سے بڑی محبت سے ملتے اور اخلاق سے پیش آتے تھے۔ اُن کی زندگی کا ابتدائی زمانہ ریاست کے ماحول میں گذرا۔ اس کے اثرات اُن کی شخصیت میں خاصے عرصے تک نمایاں رہے لیکن جب وہ اس ماحول سے باہر نکلے، اور دُنیا کو دیکھا تو اُن کی شخصیت میں خاصی تبدیلی رونما ہوئی۔ وہ ایک اچھے انسان، ایک مخلص دوست ایک محنتی اور جفاکش عالم اور ایک مرنجان مرنج شخصیت کے انسان بن گئے۔ مغربی ممالک کے قیام کا اثر اُن پر بہت اچھا ہوا، اور وہاں کی زندگی کے اعلیٰ معیار اُن کی شخصیت کا جُز بن گئے۔

انہوں نے انگلستان، کینیڈا، امریکہ وغیرہ میں رہ کر قابل رشک علمی کام کیا، اور اسلامیان پاکستان و ہند کی تہذیب و ثقافت اور فکر و فلسفہ پر ایسی کتابیں تالیف کیں جن کو بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی، اور جن کی بدولت اسلامی تاریخ، اور تہذیب و ثقافت کی برتری کا احساس و شعور مشرق و مغرب میں عام ہوا۔ اُن کی یہ تصانیف ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائیں گی، اور اسلامیان پاکستان و ہند کی تہذیب سے دلچسپی لینے والے ہمیشہ اِن سے استفادہ کرتے رہیں گے۔

یہ صحیح ہے کہ عزیز احمد صاحب کا مزاج بنیادی طور پر تخلیقی تھا، اور اس تخلیقی مزاج کی وجہ سے اُن کی شخصیت میں ایک عجب طرح کی کشش تھی۔ اس تخلیقی مزاج کی وجہ سے انہوں نے افسانے اور ناول لکھ کر اُردو ادب میں گراں قدر اضافے کئے۔ اُن کے ناول شبنم، ہوس، مرمر اور خون، آگ، گریز، ایسی بلندی ایسی پستی اور بے شمار افسانے ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کے نقاد بھی تھے، اور اُن کی تنقیدوں میں بھی اُن کا یہ تخلیقی مزاج مختلف زاویوں سے اپنی جھلکیاں دکھاتا ہے۔

اسلام، پاکستان اور اُردو کی اُنھوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں،
انھوں نے اپنی زندگی اِن کاموں کے لئے وقف کر دی۔ اور علمی ادبی دُنیا میں
اس اعتبار سے جو گراں قدر کارنامے انجام دیئے، وہ ہمارے تہذیبی اُفق پر
درخشندہ ستاروں کی طرح ہمیشہ ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے۔

حبیب جالب

کوئی بیس پچیس سال اُدھر کی بات ہے لاہور کی ادبی محفلوں میں ایک نوجوان باقاعدگی سے شریک ہوتا۔ مشاعروں میں لہک لہک کر اپنا کلام پڑھتا اور سُننے والوں کو اپنے کلام اور اپنے لحن سے مسحور کر دیتا تھا۔ اس کی باتوں میں بھی مسحور کر دینے والی کیفیت تھی۔ جوش اور جذبے سے بات کرتا لیکن اس کی باتیں پوری طرح واضح نہیں ہوتیں، البتہ یہ احساس ضرور ہوتا کہ اس کی باتیں دل سے نکلی ہوئی ہیں اور جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اس میں صداقت اور خلوص کی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔

یہ نوجوان حبیب جالب تھا۔

میانہ قد، گول چہرہ، بھرا بھرا جسم، سر پہ لمبے لمبے بال، گندمی رنگ، آواز میں گرج، مزاج میں باقاعدگی لیکن رندی اور درویشی کے رنگ کے ساتھ ہم آہنگ —— وہ عام طور پہ کُرتے پاجامے اور شیروانی میں ملبوس نظر آتا کبھی کبھی مغربی لباس بھی زیب تن کرتا۔ لیکن ہر لباس میں، اس کے ایک ایک انداز سے وجاہت ٹپکتی۔ کیا خوب نوجوان تھا!

اس زمانے میں ہم لوگ شام کا تھوڑا سا وقت کسی نہ کسی اوسط درجے کے

ریستوران میں گذارتے تھے۔ وہ باقاعدگی سے تو ہمارے ساتھ نہیں بیٹھتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی موڈ ہوتا تو ہمارے پاس بھی آجاتا تھا۔ مجھے وہ اچھا لگتا تھا، اُس کی باتیں بھی مزہ دیتی تھیں، اس کے شعر بھی متاثر کرتے تھے۔ اس لئے جب بھی وہ ہماری محفل میں شریک ہوتا تو میرے لئے خاصی دلچسپی کا سامان فراہم ہو جاتا۔

کبھی کبھی وہ لاہور سے غائب بھی ہو جاتا اور ہفتوں اور مہینوں نظر نہ آتا۔ واپس آتا تو بڑے ہی خلوص اور محبت سے ملتا۔ گلے سے لگاتا، معانقہ کرتا۔ مزاج پوچھتا۔ سفر کی تفصیل سناتا، ہمارے حالات معلوم کرتا اور مجھے اُس کے اِس انداز میں خلوص اور محبت کے سمندر موج زن نظر آتے۔

اسی زمانے میں ایک دن ایسا ہوا کہ حبیب جالب میرے پاس اورینٹل کالج میں آیا۔ اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد مجھ سے کہنے لگا "مجھے آپ اورینٹل کالج میں داخل کر لیجئے۔"

میں اُس کی یہ بات سُن کر حیران بھی ہوا اور پریشان بھی —— حیران تو اس لئے کہ حبیب جالب کو یہ کیا سوجھی اور پریشان اس لئے کہ دوست اگر شاگرد بن جائے تو اُستاد کی حیثیت کچھ ڈانوا ڈول سی ہو جاتی ہے اور کچھ عجیب سا معلوم ہونے لگتا ہے۔

اس لئے ایمانداری کی بات یہ ہے کہ میں نے حبیب جالب کو ٹالنے کی کوشش کی اور اُسے یہ سمجھایا کہ اس کی ادبی حیثیت مُسلّم ہے۔ طالب علم ہو جانے سے اُسے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

لیکن حبیب جالب نے میری ایک نہ سُنی اور داخل ہونے پر اصرار کرتا رہا۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ وہ داخلے کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہے، اور میری بات ماننے کے لئے تیار نہیں تو میں نے سپر ڈال دی۔

اور اس طرح وہ اورینٹل کالج میں داخل ہو گیا۔ اس زمانے میں داخلوں پر پابندی نہیں تھی۔

میں نے اس کو اس لئے داخل کیا کہ ایک تو اس زمانے میں داخلے پر کوئی پابندی نہیں تھی دوسرے یہ کہ اس طرح وہ اُردو ادب کا باقاعدگی سے مطالعہ کر سکے گا۔ میں نے سوچا ڈگری تو اس کے لئے بے معنی چیز ہے، وہ ان ڈگریوں کو لے کر کیا کرے گا۔ ہاں ہمارے کالج میں ذرا شعروادب کی فضا پیدا ہوگی، اور لڑکوں لڑکیوں پر اس کا اچھا اثر ہوگا۔

اس لئے میں نے حبیب جالب کو اپنا شاگرد بنالیا۔

لیکن میں نے اس کے بعد، اس میں ایک عجیب سی تبدیلی دیکھی۔ مہذب اور شائستہ تو وہ اس سے قبل بھی ایسا تھا کہ اُس کی مثال دینی چاہیئے۔ لیکن اب یہ ہوا کہ احترام کا احساس اس کے ہاں بہت بڑھ گیا، اور وہ عام طالب علموں سے بھی کہیں زیادہ اپنے عمل سے اس کا اظہار کرنے لگا۔

مجھے اُس کے اس انداز سے شروع شروع تو کچھ اُلجھن بھی ہوئی لیکن بالآخر میں نے اُس کے اس رویّے سے مطابقت پیدا کرلی کیونکہ میں نے یہ محسوس کیا کہ اُس میں جو فطری نیکی اور شرافت، تہذیب اور شائستگی ہے، اُس کو کوئی بدل نہیں سکتا۔

اورینٹل کالج میں حبیب جالب کے آنے سے ادبی محفلیں گرم ہونے لگیں۔ شعروشاعری کا ماحول پیدا ہوگیا اور چھوٹے یا بڑے پیمانے پر مشاعرے باقاعدگی سے ہونے لگے۔

اور میں اس فضا اور ماحول سے بہت خوش ہوا۔

یہ زمانہ حبیب جالب کی شاعری کے لئے بھی بہت مفید اور بارآور ثابت ہوا۔ اس زمانے میں اُس نے جو غزلیں تخلیق کیں، اُن میں ایک نیا احساس تھا۔ زندگی کو جاننے اور حالات کو پہچاننے کا ایک نیا شعور تھا۔ زمانے کی مزاج دانی اور ماحول کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کی خواہش اُس میں کچھ زیادہ ہی نمایاں تھی ـــ اور اس صورت حال نے حبیب جالب کو صداقت کا ترجمان خلوص کا عکاس

اور حقائق کا نباض بنا دیا ـــــ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ خصوصیات، حبیب جالب کے کلام میں اس سے قبل موجود نہیں تھیں۔ ایسا نہیں ہے۔ لیکن اب اُس کے شعور پر خاصی جِلا ہو گئی اور نظریئے کی پختگی کا احساس اُس کے یہاں زیادہ نمایاں ہونے لگا ـــــ اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ کلاسیکی رنگ، جس پر اُس کی شاعری کی بُنیاد استوار تھی، وہ اُس کے ہاں وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ گہرا ہوتا گیا۔

اور یہ سب اُس کے کلام کی ایسی خصوصیات ہیں جو اس کی دلکش اور دلنشیں شاعری میں آج بھی نمایاں ہیں۔ اور ہمیشہ نمایاں رہیں گی۔

حبیب جالب نظریے کا شاعر ہے ـــــ اس لئے کہ وہ نظریے کا انسان ہے۔ زندگی کی قدریں اُسے بے حد عزیز ہیں ـــــ وہ بے قاعدگی، ظلم، ناانصافی، تعیش پسندی، اخلاقی پستی، سماجی ناہمواری کا دُشمن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کے سفر میں ہر اس شخص کے ساتھ ہو جاتا ہے جو ان قدروں کو ساتھ لے کر چلتا ہے، لیکن جہاں ان قدروں سے ان کا دامن چھوٹتا ہے، حبیب جالب اس سے علیحدگی اختیار کر لیتا ہے۔ اور اپنے فکر و فن کے نشتروں سے اُس کے بخئے اُدھیڑ دیتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اس وطن عزیز میں اب تک جو کچھ ہوا ہے، اور مختلف حکومتوں، اداروں اور لوگوں نے اس پر مختلف طریقوں سے جو ستم ڈھائے ہیں، جب اُس کی تاریخ مرتب کی جائے گی تو اس میں حبیب جالب کے اُس جہاد کا ذکر سُنہرے حروف میں کیا جائے گا جو اُس نے جبر و استبداد اور ظلم و ستم کے خلاف اپنی شاعری میں کیا ہے۔

میرے نزدیک وہ ایک اہم شاعر ہی نہیں ایک اہم انسان بھی ہے، کیونکہ

اُس نے خیر کی قدروں کو عام کرنے کے لئے قید و بند کی صعوبتیں تک اُٹھائی ہیں اور اپنا تن من دھن سب کچھ لُٹا دیا ہے ۔ وہ عُسرت کی زندگی بسر کرتا ہے لیکن کسی کے سامنے سپر نہیں ڈالتا ۔

میں جب بھی اس سے ملتا ہوں تو وہ مجھے بریشم کی طرح نرم نظر آتا ہے لیکن میری نظریں اس کی شخصیت میں باطل کے لئے ایک شمشیر برہنہ اور خنجر عُریاں کو بھی پنہاں دیکھتی ہیں ۔

اور یہی اس کی شخصیت اور شاعری کی سب سے اہم خصوصیت ہے !

پروفیسر سراج الدین

پروفیسر سراج الدین انگریزی ادبیات کے نامور پروفیسر تھے۔ اُن کا شمار گنتی کے اُن مشہور و معروف انگریز زبان و ادب کے پروفیسروں میں ہوتا تھا جن کی وجہ سے اس برِّعظیم پاکستان و ہند میں انگریزی ادبیات کے مطالعے کا صحیح ماحول پیدا ہوا۔ اِن میں پروفیسر جھا، پروفیسر سدھانت، پروفیسر بخاری، پروفیسر خواجہ منظور حسین وغیرہ کے نام سرِفہرست ہیں۔ پروفیسر سراج کا نام بھی انگریزی ادبیات کے ان شہرۂ آفاق پروفیسروں کے ساتھ لیا جانا چاہیئے۔ اُنھوں نے ساری زندگی انگریزی ادب پڑھایا، ہزارہا طالب علموں کے دلوں میں انگریزی ادبیات کے مطالعے کا ذوق و شوق پیدا کیا، اور اُن کے دلوں میں ادبیات کے مطالعے کی ایسی شمعیں فروزاں کیں جن کی روشنی میں وہ ہمیشہ اس راستے پر آگے کی طرف بڑھتے رہے۔

میں نے سراج صاحب کا نام اپنی طالب علمی کے زمانے میں سُنا تھا۔ میں اس زمانے میں انگریزی ادبیات کا طالب علم تھا، اور لکھنؤ یونیورسٹی میں پروفیسر سدھانت اور پروفیسر دیا موائے متراکا شاگرد تھا۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں پروفیسر سراج کی بڑی عزت تھی۔ وہ لکھنؤ یونیورسٹی کے ام۔ اے اور بی۔ اے آنرز انگریزی کے ممتحن بھی ہوتے تھے۔ اس لئے ہم لوگ غائبانہ طور پر ان سے بخوبی آشنا تھے۔

اُس زمانے میں ایک ایسے صاحب لاہور سے لکھنؤ آئے جو گورنمنٹ کالج لاہور میں سراج صاحب کے طالب علم رہ چکے تھے۔ اُن سے یونیورسٹی کے ہوسٹل میں مُلاقات ہوئی تو اُنہوں نے غائبانہ طور پر پروفیسر سراج الدین صاحب کا تعارف کرایا۔ انہوں نے بتایا کہ سراج صاحب آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ ہیں۔ انہوں نے دُنیا کی اس اہم یونیورسٹی سے انگریزی ادبیات میں بی لٹ کی ڈگری لی ہے۔ اور اب گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی ادبیات کا درس دیتے ہیں۔ بڑی ہی دلکش اور دلآویز شخصیت کے مالک ہیں۔ انگریزی ادبیات کا ایک خزانہ اُن کے سینے میں محفوظ ہے۔ لیکچر دیتے ہیں تو علم کا ایک سمندر موجزن ہوتا ہے۔ اور ایسی دلنشیں زبان اور دلکش لہجے میں باتیں کرتے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پھولوں کی بارش ہو رہی ہے۔ طالب علم اُن کے لیکچر سے مسحور ہو جاتے ہیں۔ اُن کی باتوں کو سحر اور اعجاز کہا جائے تو بے جا نہیں!

یہ باتیں سُن کر میرے دل میں سراج صاحب کو دیکھنے اور اُن کے لیکچر سُننے کی خواہش بیدار ہوئی لیکن ایک زمانے تک یہ خواہش دل کی دل ہی میں رہی۔ کیونکہ اس زمانے میں میرا لاہور جانا، اُن سے ملنا اور اُن کے علم سے استفادہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ میں اس زمانے میں لکھنؤ یونیورسٹی کا باقاعدہ طالب علم تھا، اور وہاں سے میرا نکلنا ناممکن تھا۔

اس کے لئے مجھے انتظار کرنا پڑا۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب میں لاہور آیا تو یہ خواہش دیرینہ تکمیل سے ہم کنار ہوئی۔

لاہور آنے کے بعد میں ایک دو دفعہ اسی خیال سے گورنمنٹ کالج گیا کہ اُن سے ملوں گا۔ لیکن اُن کی مصروفیت کی وجہ سے مُلاقات نہ ہوسکی۔ ایک دن گورنمنٹ کالج کی کسی تقریب میں انہیں دور سے دیکھا۔ جب جلسے کے آخر میں اُنہوں نے صدارتی تقریر کی، اور میں نے اُن کی تقریر سُنی تو میری یہ خواہش پوری ہوگئی۔ کیا خوبصورت تقریر تھی!

اس تقریر میں ادب کے حوالے تھے۔ بڑے بڑے شاعروں، خصوصاً انگریزی

شاعروں کا بیان تھا۔ شیکسپیئر کا ذکر تھا، مارلو کی باتیں تھیں۔ ڈکنس کا تذکرہ تھا۔ ٹی۔ ایس۔ براؤننگ، شیلے، کیٹس، لانگ فیلو، ایلیٹ، پاؤنڈ اور جیمس جوائس کی تخلیقات کا تذکرہ تھا۔ فلسفیوں کے خیالات و نظریات کی نقاب کشائی تھی۔ جلسہ تو تعلیمی نوعیت کا تھا، لیکن سراج صاحب ان سب کی باتیں کرکے تعلیم کے انسانی پہلوؤں کی وضاحت کر رہے تھے، انسانی رشتوں اور انسانی قدروں کی اہمیت ذہن نشین کروا رہے تھے۔ افکار و خیالات کا ایک سمندر موج زن تھا الفاظ ایسے خوبصورت اور سانچے میں ڈھلے ڈھلائے تھے، اور لہجے میں ایسی شیرینی تھی کہ معلوم ہوتا تھا شہد و شکر کی جوئے سبک خرام رواں دواں ہے۔

جلسے کے بعد جب چائے کا دور شروع ہوا تو میں ہمت کرکے سراج صاحب کے پاس گیا اور کہا "میں اورینٹل کالج میں اُردو ادب پڑھاتا ہوں۔ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے آج اس جلسے کی بدولت آپ کی تقریر سُننے کا موقع ملا۔ لُطف آگیا۔ جیسا سنا تھا، اُس سے بھی بڑھ کر آپ کو پایا۔ آپ کے انداز بیان میں ایک عجب طرح کی ساحری تھی۔ میں تو مسحور ہوگیا اور شاید ہمیشہ مسحور رہوں گا۔"

سراج صاحب یہ سُن کر کچھ شرمائے اور پریشان سے ہوئے اور کہنے لگے "آپ ادب کے اُستاد ہیں غالباً اسی لئے میری باتوں سے مُتاثر ہوئے۔ یہ سب حُسنِ ظن اور حُسنِ نظر کی بات ہے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ کچھ اور لوگوں نے سراج صاحب کو آگھیرا، اور بہت سی باتیں جو میرے دل میں مچل رہی تھیں، وہ دل کی دل ہی میں رہیں۔ میں تشنگی کا احساس لے کر وہاں سے واپس آیا۔

سراج صاحب اس زمانے میں جوان تھے۔ عمر کوئی چالیس پینتالیس کے لگ بھگ تھی لیکن معلوم اس سے بھی کم ہوتی تھی۔ میانہ قد، گول چہرہ، سانولا رنگ لیکن اس پر سُرخی، سر پر گھنے سیاہ بال، تندرست و توانا بھرا بھرا جسم، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں جن میں ذہانت کی چمک تھی، گہرے نیلے رنگ کے سوٹ اور سادہ سی ٹائی میں

میں ملبوس ۔۔۔ یہ تھے گورنمنٹ کالج لاہور کے انگریزی زبان وادب کے پروفیسر اور پرنسپل جن کو آج پہلی دفعہ دیکھنے، ملنے اور اُن سے باتیں کرنے کی سعادت مجھے نصیب ہوئی۔

اور میں اس پہلی ہی مُلاقات میں سراج صاحب کا گرویدہ ہوگیا ۔ اور یہ سوچتا رہا کہ میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ ایک عظیم انسان اور انگریزی زبان کے ایک دل موہ لینے والے پروفیسر سے میری مُلاقات ہوئی۔

پھر چند روز کے بعد میں نے اُن سے ملنے کے لیئے وقت مُقرر کیا۔ وہ بڑی خوشی سے مُجھے وقت دینے کے لیئے تیار ہوگئے ۔چنانچہ میں مُقررہ وقت پر گورنمنٹ کالج پہنچا۔ سراج صاحب کو اطلاع کروائی۔ اُنہوں نے فوراً مجھے اندر اپنے دفتر کے کمرے میں بُلالیا ، اور خود باتیں شروع کردیں۔

کہنے لگے "اُس دن جلسے کے بعد آپ سے مختصر سی مُلاقات ہوئی۔ کچھ اور لوگوں نے گھیرلیا۔ آپ پریشان ہوکر چلے گئے ۔ میں آپ کے ایسے مزاج کے لوگوں کو سمجھتا ہوں۔"

میں نے کہا "ہنگامہ بہت تھا۔ میں نے یہ سوچا کہ ایسے میں آپ سے ظاہر ہے کہ باتیں نہیں ہوسکیں گی۔ اس لیئے میں نے دخل در معقولات کو مناسب نہیں سمجھا۔"

پھر اُنہوں نے پوچھا "آپ کب لاہور آئے"؟

میں نے کہا "مجھے آئے ہوئے کئی مہینے ہوگئے ہیں ۔ مصروف اور پریشان رہا۔ اس لیئے آپ کی خدمت میں اس سے قبل حاضر نہ ہوسکا۔ یہ بھی خیال ہوا کہ آپ مصروف بہت ہیں۔ آپ کا وقت بہت قیمتی ہے۔"

سراج صاحب کہنے لگے "مصروفیت تو رہتی ہی ہے۔ لیکن محبت کرنے والے لوگوں سے ملنا ایک خوشگوار تجربہ ہوتا ہے۔ میں تو ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتا ہوں ، اور اُن سے مِل کر مجھے صحیح معنوں میں خوشی ہوتی ہے ۔ میں نے آپ کے کچھ مضامین مختلف ادبی رسالوں میں پڑھے ہیں، اور اُن سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ آپ کو انگریزی اور اُردو ادب سے گہری دلچسپی ہے۔"

میں نے کہا "میں ادب کا ایک معمولی سا طالب علم ہوں ۔ ادب کسی زبان کا بھی ہو ،

اس کو شوق سے پڑھتا ہوں۔ انگریزی ادب سے بھی مجھے دلچسپی رہی ہے۔ انگریزی کے پروفیسروں سے میں نے بہت استفادہ کیا ہے۔ استفادے ہی کے خیال سے آپ سے ملنے کو جی چاہتا تھا۔ شکر ہے کہ لاہور آ کر میری یہ خواہش پوری ہوئی۔"

دورانِ گفتگو سراج صاحب نے انگریزی کے شاعروں کا ذکر چھیڑ دیا۔ پھر ڈرامہ نگاروں پر بات کرنے لگے۔ اہم ناول نگاروں کے بارے میں بھی باتیں کیں۔ انگریزی کے قدیم اور جدید ادب کے بھی خاصے حوالے دیئے۔

غرض دیر تک یہ باتیں ہوتی رہیں، میں اِن باتوں سے لُطف اندوز ہوتا رہا۔ اور چہرے کی مخصوص کیفیت سے سراج صاحب کے علم، رچے ہوئے ادبی ذوق اور لہجے کی شیرینی کی داد دیتا رہا۔

ایک گھنٹے کی اس پرلُطف مُلاقات کے بعد میں نے اُن سے یہ کہہ کر اجازت لی کہ "میں نے آپ کا بہت وقت لیا۔ آپ کی اس نوازش اور لُطف و کرم کو میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ انشاءاللہ آئندہ بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں گی۔"

پروفیسر صاحب چلتے وقت کہنے لگے "اس مہینے کے آخری ہفتے میں برٹش کونسل نے میرے پانچ چھ لیکچروں کا انتظام کیا ہے۔ یہ لیکچر انگریزی ادب کے مختلف پہلوؤں پر ہوں گے۔ اگر آپ کے پاس وقت ہو تو برٹش کونسل میں ضرور آیئے گا۔ میں دعوت نامہ آپ کو بھجوا دوں گا۔"

چنانچہ ایک ہفتے کے بعد میرے پاس برٹش کونسل کی طرف سے اِن لیکچروں میں شرکت کرنے کے لئے دعوت نامہ آیا۔ یہ لیکچر انگریزی کے رومانی شاعروں پر تھے۔

پروگرام کے مطابق میں مہینے کے آخر میں سراج صاحب کے لیکچروں میں شریک ہونے کے لئے برٹش کونسل گیا۔ ایک ہفتے تک میں نے باقاعدگی سے اِن لیکچروں میں شرکت کی۔ یہ لیکچر اتنے عالمانہ اور اس قدر دلچسپ تھے کہ حاضرین ان سے مسحور ہو گئے۔ میں بھی بہت لُطف اندوز ہوا۔ اور سراج صاحب کی عظمت کا سکہ میرے دل پر اس طرح بیٹھا کہ میں اپنے ملنے والوں سے بار بار اس کا ذکر کرنے لگا۔

پھر کچھ عرصے بعد جب پنجاب یونیورسٹی میں انگریزی زبان و ادب کا شعبہ قائم ہوا تو پروفیسر سراج الدین صاحب اُس میں پروفیسر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے آگئے۔ اب اُن سے مجھے خاصی قربت حاصل ہوگئی۔ میں اکثر اورینٹل کالج سے اُٹھ کر اُن کے پاس چلا جاتا تھا اور اُن کی دلچسپ باتوں سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ سراج صاحب مجھے خاصا وقت دیتے تھے۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ میں اُن سے ادبی موضوعات پر کچھ کتابیں بھی لے آتا تھا۔ ان ملاقاتوں سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ سراج صاحب کی باتوں سے میرے دل میں انگریزی ادبیات سے دلچسپی لینے کی خواہش مزید استوار ہوئی، اور میرے ادبی ذوق و شوق میں خاصا اضافہ ہوا۔

اس زمانے میں پروفیسر صاحب یونیورسٹی کے جرنل آف ریسرچ کی مجلس ادارت کے صدر بھی تھے۔ میں اس کے اڈیٹوریل بورڈ کا ممبر تھا۔ سراج صاحب نے مجھ سے اس زمانے میں اصرار کر کے جرنل کے لئے کئی مضامین لکھوائے اور ان کو اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ سراج صاحب کی ہمت افزائی شامل نہ ہوتی تو شاید ان مضامین کو لکھنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ خاص طور پر غالب کے فن پر میں نے جو طویل مقالہ لکھا تھا۔ اس کو سراج صاحب نے بہت پسند کیا، اور علمی ادبی حلقوں میں اس کی تعریف کی۔ یہ مقالہ اب کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکا ہے، اور اس پر اچھے تبصرے ہوئے ہیں۔ اس کو لکھوانے کا سہرا پروفیسر سراج الدین صاحب اور مشہور غالب شناس پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کے سر ہے۔

پروفیسر سراج صاحب صحیح معنوں میں ادبی آدمی تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بے شمار شاگردوں کے ادبی ذوق کی آبیاری کی۔ ہزارہا افراد کے دلوں میں ادب سے دلچسپی کے چراغ روشن کئے۔ کئی نسلوں کو انہوں نے ادب کے ذریعے سے انسان بنایا اور انسانی اقدار کے احساس سے انہیں مالا مال کیا۔ اور ادب کا یہی بنیادی مقصد ہے جو سراج صاحب کے ہاتھوں تکمیل سے ہم کنار رہا۔

سراج صاحب خود بڑے ہی انسان دوست آدمی تھے اور اُن کو انسان دوست

بنانے میں ادب سے اُن کی دلچسپی کا بہت بڑا حصہ تھا۔ وہ کسی انسان کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہر ایک سے محبت کے ساتھ پیش آنا اُن کا مزاج تھا۔ وہ ہر شخص کی مدد کرتے تھے، اور ہر ایک کا جائز کام کر دیتے تھے۔ طالب علموں پر تو اُن کی شفقت بے اندازہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ طالب علم اُن کی پرستش کرتے تھے، اور اُنہیں اپنا مُربی، رہنما، سرپرست بلکہ اپنا باپ سمجھتے تھے۔ میں نے کبھی کسی شخص کو اُن کے دَر سے ناکام اور ناآسودہ واپس جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اگر کسی وجہ سے کسی کا کام نہیں ہو سکتا تھا تو وہ اپنی گل افشانیٔ گفتار سے اسے مطمئن کر دیتے تھے۔

اور انسان تو خیر انسان ہیں، اشرف المخلوقات ہیں، وہ جانوروں تک کا خیال رکھتے تھے۔ شام کو اُن کا یہ معمول تھا کہ وہ کُتوں، بلیوں اور دوسرے جانوروں کے لئے کھانا لے کر نکلتے تھے، اور اُن کا یہ عمل اتنی طویل مُدت پر پھیلا ہوا تھا کہ جانور اُن کے دوست بن گئے تھے، اور شام کو جن راستوں سے اُن کا گذر ہوتا تھا، وہاں وہ اُن کا انتظار کرتے تھے۔

یہ معمول اُن کا اس وقت بھی تھا جب وہ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل تھے، اور گورنمنٹ کالج ہی کے ایک بنگلے میں اُن کا قیام تھا۔ شام کو وہ ہر موسم میں اپنا مخصوص انداز کا سوٹ پہن کر اپنی چھڑی ہاتھ میں لے کر گورنمنٹ کالج سے باہر نکلتے تھے۔ دو آدمی اُن کے ساتھ ہوتے تھے۔ گورنمنٹ کالج کے آس پاس گھوم پھر کر وہ مال روڈ پر آتے تھے، اور ریگل یا الحمرا تک جاتے تھے۔ راستے میں مال روڈ پر اور اس کے آس پاس اُن کے آدمی اُن کی موجودگی میں جانوروں کو کھانا ڈالتے جاتے تھے۔ اور یہ جانور اس کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ انہیں شام کے وقت سراج صاحب کا انتظار رہتا تھا۔

جب پروفیسر صاحب گورنمنٹ کالج سے یونیورسٹی میں آ گئے اور انہوں نے لاہور کینٹ میں سرور روڈ پر اپنا مکان بنا لیا تو وہاں بھی اُن کے اس معمول میں فرق

نہیں آیا۔ وہاں بھی وہ شام کو سیر کے لیئے باہر نکلتے۔ دور تک جاتے اور اُن کے ساتھ جو مُلازم ہوتے وہ مختلف مقامات پر انتظار کرنے والے جانوروں کو کھانا ڈالتے ــــ سراج صاحب کی شامیں یہاں بھی اسی طرح گذرتی تھیں۔ سیر بھی ہو جاتی تھی، اور صدقہ جاریہ کا یہ سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔

ایک دن میں نے پروفیسر صاحب سے پوچھا "سب جانتے ہیں کہ آپ ایک زمانے سے شام کو جب باہر نکلتے ہیں تو جانوروں کو کھانا بھی کھلاتے ہیں۔ آخر یہ خیال آپ کو کیسے آیا، اور آپ کے معمولات میں اس پہلو نے اتنی اہمیت کیوں اختیار کر لی ہے؟"۔

سراج صاحب نے جواب دیا "آخر جانور بھی تو خُدا کی مخلوق ہیں۔ اُن کو بھی تو کھانے کی ضرورت ہے۔ اسی خیال نے مجھے مجبور کیا کہ میں اُن کی کوئی خدمت کروں ــــ یہ سب کچھ میں خدمت کے جذبے سے کرتا ہوں، اور اس سے مجھے ایک عجیب طرح کی طمانیت نصیب ہوتی ہے"۔

میں نے کہا "ــــ لیکن پروفیسر صاحب! کیا انسان جانوروں سے زیادہ اس کے مستحق نہیں ہیں"؟

پروفیسر صاحب کہنے لگے "جس حد تک ہو سکتا ہے میں انسانوں کی بھی خدمت کرتا ہوں۔ لیکن انسان کا معاملہ تو یہ ہے کہ وہ زبان رکھتا ہے۔ بول سکتا ہے۔ ضرورت ہو تو مانگ بھی سکتا ہے۔ جانور تو بے زبان مخلوق ہے۔ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ بول نہیں سکتا کچھ طلب نہیں کر سکتا۔ لوگ اُن کی پروا بھی نہیں کرتے۔ اس لئے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ میں اِن بے زبانوں کی خدمت کروں۔ چنانچہ برسوں سے میں نے اس کو اپنا معمول بنا لیا ہے۔ بعض لوگ میرے اس رویے پر ہنستے ہیں، لیکن میں اُن کی پروا نہیں کرتا ــــ اپنا کام کرتا ہوں۔ فرض سمجھ کر اس خدمت کو انجام دیتا ہوں۔ میں سیدھا سادہ مسلمان ہوں زیادہ مذہبی آدمی نہیں ہوں، ورنہ آپ سے یہ کہتا کہ ہمارے رسولؐ نے بھی بار بار اس کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جانوروں کو کھانا کھلانا چاہیئے۔ اُن کی

خدمت کرنی چاہئیے ۔ ہمارے دین اسلام میں اس کو صدقہ کہتے ہیں، اور صدقے کو بڑی اہمیت دی گئی ہے ۔ اس سے انسان کو ایک عجب طرح کی طمانیت نصیب ہوتی ہے۔ سکون ملتا ہے ۔ کہتے ہیں اس سے بہت سی بلائیں بھی ٹل جاتی ہیں۔ انسان حادثات سے بھی محفوظ رہتا ہے ۔ آپ نے ہندوؤں کو دیکھا ہوگا۔ وہ جب صبح کے وقت اشنان کے لئے یا پوجا پاٹ کی غرض سے باہر نکلتے تھے تو چیونٹیوں کو شکر یا آٹا ڈالتے جاتے تھے ۔ کُتّوں اور بلّیوں، چیلوں اور کوّوں کی اہمیت بھی اس اعتبار سے کسی طرح کم نہیں ہے ۔"

میں اُن کی یہ باتیں چُپ چاپ سُنتا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ سراج صاحب کتنے رحم دل ہیں اور خدمت کے جذبے سے کس درجہ سرشار ہیں۔

پھر کہنے لگے ۔"انسان اشرف المخلوقات ہے۔ جدوجہد بھی کر سکتا ہے ۔ محنت کر کے پیٹ بھر سکتا ہے ۔ کنواں بھی کھود سکتا ہے ۔ جانور یہ سب کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کی صلاحیتیں محدود ہیں ــــ اور پھر انسان تو ایک دوسرے کو نقصان بھی پہنچاتا ہے ۔ اُس کی فطرت میں تو ایذا رسانی ہے ۔ ظلم و ستم ہے ۔ وہ احسان بہت کم مانتا ہے۔ بے چارے جانور ایسا نہیں کرتے ۔ احسان مانتے ہیں، اور اگر اُن پر احسان کیا جائے تو وہ انسان کو تکلیف نہیں پہنچاتے ۔ برخلاف اس کے مانوس ہو جاتے ہیں، محبت کا اظہار کرنے لگتے ہیں ۔ میں شام کو جب اس کام کے لئے نکلتا ہوں تو جگہ جگہ مختلف جانور میرا انتظار کرتے ہیں اور اپنی بے زبانی سے محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ اُن کی یہ کیفیت دیکھنے والی ہوتی ہے "ــــ

دراصل بات یہ ہے کہ سراج صاحب نے اپنی زندگی کا خاصا عرصہ انگلستان میں گذارا تھا۔ وہاں لوگ جانوروں کو بڑی اہمیت دیتے ہیں ۔ اُن کا خیال رکھتے ہیں۔ اُن سے پیار کرتے ہیں۔ اُنھیں تکلیف نہیں پہنچاتے ۔ جانوروں کو بڑے شوق سے پالتے ہیں۔ وہ بیمار ہو جائیں تو اُن کا باقاعدہ علاج کرواتے ہیں، مر جائیں تو اُن کی قبریں بناتے ہیں، اور اُن کی قبروں پر کتبے لگاتے ہیں۔ انگلستان کے دوران قیام میں جب میں

آکسفورڈ اور کیمرج کے بعض کالجوں میں گیا تو میدانوں کے بعض حصّوں میں یہ دیکھا کہ کُتّوں اور بلیّوں کی قبریں بنی ہوئی ہیں۔ ان پر کتبے لگے ہوئے ہیں، اور اُن پر انتہائی جذباتی انداز میں یہ لکھا ہوا ہے کہ یہ کئی سال تک ہمارے ساتھ رہا اور اس نے ہمیں بڑی مسرت بہم پہنچائی ہے۔ بعض جانوروں کی قبروں پر میں نے باقاعدہ نظمیں لکھی ہوئی دیکھیں۔ یقیناً اس کا اثر بھی سراج صاحب پر ہوا ہو گا۔ انگلستان میں جانور کو ایذا پہنچانا جرم ہے۔ اگر کوئی اپنے گھر میں کسی جانور کو ذبح کرے تو اس پر خاصا جُرمانہ ہوتا ہے کیونکہ انتظامیہ کا خیال ہے کہ اس طرح اُس کو ایذا پہنچتی ہے، تکلیف ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں جانوروں کو مشینوں سے ذبح کیا جاتا ہے۔ اس خیال سے کہ ایک لمحے میں یہ کام مکمل ہو جاتا ہے اور جانور کو تکلیف نہیں ہوتی۔

لیکن جانوروں سے دلچسپی لینے اور اُن کی خدمت کرنے کی بڑی وجہ سراج صاحب کی انسانیت، شرافت اور نرم دلی تھی۔ وہ جانور تک کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اسی لئے اُن کی خدمت کو انہوں نے اپنا معمول بنا لیا تھا۔ اس سے انہیں خوشی ہوتی تھی، اور سکون نصیب ہوتا تھا۔

سراج صاحب محبت کے آدمی تھے۔ ہر ایک سے محبت کرتے تھے۔ جان دار چیزوں، یعنی انسانوں اور جانوروں سے تو انہیں محبت تھی ہی، لیکن وہ بے جان چیزوں تک سے محبت کرتے تھے۔ اپنے وطن، اپنے شہر، اپنی شاہراہوں، اپنے بازاروں، اپنی درسگاہوں اپنے گھر اور اپنے دفتر تک کی بے جان چیزوں کے ساتھ اُن کا ایک جذباتی رابطہ تھا۔ وہ ان سے کبھی اپنے آپ کو جُدا نہیں کرتے تھے۔ اگر حالات کے نشیب و فراز انہیں اِن چیزوں سے جُدا کر بھی دیں تو انہیں صدمہ ہوتا تھا، اور وہ انہیں یاد کرتے تھے۔ یادوں کی صورت میں اِن سے سراج صاحب کی وابستگی ہر حال میں باقی رہتی تھی۔ وہ کبھی کسی کی بُرائی نہیں کرتے تھے۔ انسان کو خطا کا پتلا سمجھ کر معاف کر دیتے تھے اور خوش رہتے تھے۔

وہ حُسن کے شیدائی تھے۔ حُسن کہیں بھی ہو وہ اس کو دیکھ کر سرشار ہو جاتے تھے۔

نیچر کا حُسن، مناظر کا حُسن، انسان کا حُسن، خاص طور پر نسوانی حُسن انہیں مست و سرشار کر دیتا تھا۔ اور وہ اس سے ایسی پاکیزہ لذّت حاصل کرتے تھے جس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ بعض باتیں اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ حُسنِ نسوانی کے بارے میں، ایسی ہیں جو ناگفتنی ہیں۔

میری عمر عزیز کے تقریباً بیس بائیس سال پروفیسر سراج الدین صاحب کی رفاقت میں گذرے۔ کچھ عرصے کے لئے وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہوگئے تھے۔ میں اُس زمانے میں اُردو کا پروفیسر، شعبۂ اُردو کا صدر، اورینٹل کالج کا پرنسپل اور اسلامیات اور مشرقی علوم کا ڈین تھا۔ اس لئے کچھ عرصے تک اُن کے ساتھ مجھے براہِ راست کام کرنے کا موقع بھی ملا۔ اور میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ اُن کے ساتھ کام کرنا ایک دلچسپ تجربہ ہے۔ وہ کبھی بگڑے نہیں تھے، ناراض نہیں ہوتے تھے۔ دفتر کے عملے کو کبھی ڈانٹتے نہیں تھے۔ پروفیسروں کی عزت کرتے تھے۔ اور بڑی فراست اور دانش مندی سے مسائل کو سُلجھاتے تھے۔ اس لئے اُن کا کام خوش اسلوبی سے چلتا تھا۔ انتظامی معاملات کو چلانے میں وہ بڑے معاملہ فہم تھے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اُن سے زیادہ کامیاب وائس چانسلر موجودہ زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کو نصیب نہیں ہوا۔

پروفیسر سراج الدین صاحب کی وائس چانسلری کا زمانہ، اگرچہ مختصر تھا لیکن اس زمانے کو مثالی کہا جا سکتا ہے۔ اس زمانے میں یونیورسٹی کے اندر اور باہر سیاسی آویزشیں اور ذاتی رنجشیں اتنی زیادہ تھیں کہ اُن پر قابو پانا کسی معمولی ذہن کے انتظامی افسر اور غیر متوازن سربراہ کے بس کی بات نہیں تھی۔ سراج صاحب نہایت ذہین اور تجربے کار افسر تھے۔ اُن کی ساری زندگی تعلیمی ماحول کے منّت پذیر شانہ گیسوؤں کو سنوارنے میں گذری تھی۔ وہ عرصۂ دراز تک بڑے بڑے تعلیمی اداروں کے پروفیسر اور پرنسپل رہے تھے۔ اس لئے اُستادوں اور طالب علموں کی نفسیات کا انہیں بخوبی علم تھا۔ وہ اکیڈمک معاملات کے بہت بڑے نبّاض تھے۔ اور پیچیدہ سے

پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ وہ لوگوں کو خوش رکھنا بھی جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن سے اختلاف رکھنے والا بھی اُن کا احترام کرتا تھا۔

اُن کے دورِ اقتدار میں ایک اکیڈمک معاملے میں خود میرا بھی اُن سے اختلاف ہوا۔ میری ایک شاگرد لڑکی سید انشاء پر پی ایچ ڈی کا کام کرنا چاہتی تھی۔ اُس نے کئی سال کی محنت کے بعد سید انشاء کی زندگی، شاعری اور دوسرے کارناموں پر میری نگرانی میں پی ایچ ڈی کے لئے کام کرنے کا خاکہ تیار کیا۔ یہ خاکہ مختلف بورڈوں اور کمیٹیوں نے منظور کر لیا لیکن جب اکیڈمک کونسل اور کمیٹی فار ہائر اسٹڈیز اینڈ ریسرچ میں پہنچا تو پروفیسر سراج الدین صاحب نے اُس پر اس خیال کا اظہار کیا کہ "یہ خاکہ انشا کی زندگی اور شاعری کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ میرے خیال میں پی ایچ ڈی کا کام کسی پرابلم پر ہونا چاہیئے تاکہ اپنے آپ کو محدود کر کے اسکالر اس پر اچھی طرح ریسرچ کرے۔ مثلاً سید انشاء کے عشق پر کام ہو تو بہتر ہے"۔

یہ سُن کر میں نے کہا کہ "ابھی تو انشاء کی زندگی ہی پر کوئی خاص کام نہیں ہوا۔ اس کے عشق پر کس طرح کام ہو سکتا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ اُس نے سرے سے عشق کیا ہی نہ ہو"۔

اس پر کمیٹی کے ممبروں نے ایک قہقہہ لگایا، اور میرے خیال کی حمایت کی۔ لیکن سراج صاحب نہیں مانے۔ کہنے لگے "یہی تو معلوم کرنا چاہیئے کہ اگر اُس نے عشق نہیں کیا تو کیوں نہیں کیا۔ عشق تو ہر شخص کرتا ہے، اور اس کو عشق کرنا چاہیئے تھا"۔

میں نے کہا "انشاء بہت مصروف آدمی تھے۔ اُن کا زیادہ وقت علمی ادبی کاموں میں گذرتا تھا وہ عشق کے جنجال میں کس طرح پھنستے؟"

غرض دیر تک اس موضوع پر دلچسپ بحث ہوتی رہی۔ سراج صاحب نے اپنے خیال کو پیش کرتے ہوئے نہایت دلچسپ باتیں کیں۔ میں اُن کی باتوں سے متاثر ہوا، لیکن اصولی طور پر اپنے مؤقف پر قائم رہا۔

میں نے کہا "انشاء، بائرن، شیلے یا کیٹس نہیں تھا۔ اس کا تعلق مشرقی معاشرے سے

تھا۔ اس لئے اس کی شخصیت کے اس پہلو پر کام نہیں ہو سکتا۔

بالآخر سراج الدین صاحب نے کہا "چلئے پہلے انشاء کی زندگی اور شاعری پر مجموعی طور پر کام کروا لیجئے۔ اس کے بعد یہ موضوع یا اسی طرح کے دوسرے موضوعات پر کسی اور سے کام کروایئے گا۔"

اس طرح یہ دلچسپ بحث ختم ہو گئی۔

دراصل بات یہ ہے کہ سراج صاحب انگریزی ادبیات کے پروفیسر تھے، آکسفورڈ، کیمرج، لندن اور انگلستان کی دوسری یونیورسٹیوں کے ماحول اور تحقیقی روایات سے پوری طرح آشنا تھے۔ اس لئے جو موقف انہوں نے اختیار کیا وہ جہاں تک انگریزی ادبیات کا تعلق ہے، بنیادی طور پر صحیح تھا، لیکن جہاں تک اُردو کا تعلق ہے اس میں تو ابھی تک بنیادی چیزوں پر بھی کام نہیں ہوا ہے۔ میرا خیال تھا پہلے ان پر کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ آئندہ تحقیق اور تلاش و جستجو آگے قدم بڑھا سکے۔

سراج صاحب نے میری بات مان لی اور اس طرح یہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو گیا۔

پنجاب یونیورسٹی میں پروفیسر سراج الدین صاحب کی وائس چانسلری کا زمانہ بڑے ہی سیاسی انتشار کا زمانہ تھا۔ آئے دن ہنگامے ہوتے رہتے تھے۔ بعض سیاسی رہنما طالب علموں کو آلۂ کار بنا کر ایک دوسرے کے خلاف ہنگامے کرواتے رہتے تھے۔ نوبت مار پیٹ اور گشت و خون تک پہنچتی تھی۔ طالب علموں پر حملے عام ہو گئے تھے۔ دو سیاسی گروہوں کے درمیان محاذ آرائی تھی جس نے یونیورسٹی کی فضا کو خراب کر دیا تھا۔

اس زمانے میں سراج صاحب نے بڑی فراست اور دانش مندی سے اس فضا کو درست کرنے کی کوشش کی اور بغیر کسی سختی یا پولیس کی مدد کے ان مسائل کو نہایت خوش اسلوبی سے حل کیا، اور اُن کی بصیرت اور تعلیمی تجربے کی بدولت حالات خاصی حد تک معمول پر آ گئے۔

سب سے بڑا ہنگامہ اس زمانے میں اورینٹل کالج میں ہوا۔ کالج میں اس وقت

طالب علموں کی یونین کا جو صدر تھا، اُس کے بارے میں بعض لوگوں نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ وہ کسی خاص شخصیت کا سیاسی کام کرتا ہے۔ چنانچہ اُس کو جان سے مارنے کے لئے مخالف گروپ کی ایک اہم سیاسی شخصیت نے خطرناک منصوبہ بنایا، اور اس سلسلے میں کچھ طالب علموں کو استعمال کیا۔

دیدہ دلیری کی حد تھی کہ ایک دن اِن لوگوں نے سراج صاحب کو فون کیا اور یہ اطلاع دی کہ گیارہ بجے اورینٹل کالج پر حملہ کیا جائے گا۔ اور یونین کے صدر کو ہم مزہ چکھا دیں گے۔ میں پرنسپل تھا۔ اس لئے سراج صاحب نے مجھے فوراً اس کی اطلاع دی۔ اور کہا کہ "میں نے پولیس کا انتظام کر لیا ہے تاکہ کشت و خون کی نوبت نہ آئے"۔

میں نے فوراً کہا کہ "پولیس کو ہدایت کر دیجئے کہ وہ باہر سڑکوں پر رہے۔ کالج کے اندر داخل نہ ہو۔ میں اصولی طور پر اس کو غلط سمجھتا ہوں۔ میں خود حالات کا مقابلہ کر لوں گا"۔

سراج صاحب نے مجھ سے اتفاق کیا۔

وقت مقررہ پر حملہ تو ہوا۔ گولیاں بھی چلیں۔ یونین کے صدر کو لہولہان بھی کر دیا گیا۔ لیکن میں نے کسی طرح اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر یونین کے صدر کی جان بچالی۔ طالب علموں پر مقدمے بھی قائم کئے گئے لیکن میرے کہنے پر سراج صاحب نے مقدمے ختم کروا دیئے۔ اور پھر میں نے ان طالب علموں کے دونوں گروپوں کو گلاب جامن کھلا کر آپس میں صلح صفائی کروا دی۔ اور اس طرح یہ سنگین معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو گیا۔

سراج صاحب کی بصیرت شامل حال نہ ہوتی، اور اُن کا تعاون مجھے حاصل نہ ہوتا تو اورینٹل کالج ہمیشہ کے لئے میدان کارزار بن جاتا، اور اس کی علمی و تعلیمی فضا بُری طرح مجروح ہوتی۔

میں نے خاصا وقت سراج الدین صاحب کے ساتھ گذارا، اور ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ وہ ایک عظیم انسان، انسانی زندگی کے ایک اہم رمز شناس، اساتذہ اور طلباء کی نفسیات کے نباض، ایک بہت بڑے پروفیسر، انگریزی ادبیات کے جید عالم، اور اکیڈمک ماحول

کو سمجھنے کی بصیرت رکھنے والے ایک اہم منتظم و منصرم تھے۔

میں اکثر اُنہیں یاد کرتا ہوں اور اُن کی دلکش و دلآویز شخصیت میرے دل میں روشنی کے رنگین قمقمے سے روشن کرتی ہے۔

جب بھی اُن کا خیال آتا ہے۔ اور یہ خیال اکثر آتا ہے، تو میرے ذہن و شعور میں کسی شاعر کے اس شعر کی نغمگی اور رعنائیت رقص کرنے لگتی ہے ؎

تِرا خیال تو تیری ہی طرح آتا ہے
ہزار چشمکِ برق و شرر چھپائے ہوئے
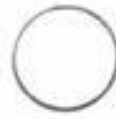
ڈاکٹر نذیر احمدؒ

آج سے تقریباً چالیس سال قبل، انار کلی میں ایک صاحب نظر آئے جو کھدر کے سفید کرتے اور تہبند (لاچے) میں ملبوس تھے۔ ایک بچے کو انہوں نے اپنے کاندھے پر بٹھا رکھا تھا۔ کبھی اس کو گود میں لے لیتے تھے کبھی کاندھے پر بٹھا لیتے تھے۔ میں انہیں اس عالم میں دیکھ کر حیران ہوا، کیونکہ اس زمانے میں لوگ زیادہ تر انگریزی لباس میں ملبوس ہو کر باہر نکلتے تھے۔ جاڑوں میں سوٹ پہن کر اور گرمیوں میں پتلون قمیص پہن کر۔ اسی لئے مجھے اُن کی یہ وضع قطع عجیب معلوم ہوئی۔

میرے ایک شاگرد ملک بشیر الرحمٰن مرحوم جو کچھ عرصے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں اُردو کے اُستاد ہو گئے۔ میرے ساتھ تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا "یہ کون صاحب ہیں جو اس طرح دیہاتی لباس میں بچے کے ساتھ انار کلی کی سیر کر رہے ہیں؟

وہ کہنے لگے "میں اُن سے واقف ہوں۔ یہ ڈاکٹر نذیر احمد ہیں۔ جھنگ میں گورنمنٹ کالج کے پرنسپل ہیں۔ سائنٹسٹ ہیں۔ نباتیات (Botany) کے پروفیسر ہیں۔ لیکن ادب اور کلچر سے انہیں دلچسپی ہے۔ درویش ہیں۔ اس لئے لباس کی پروا نہیں کرتے۔ اس لباس کو اپنا قومی لباس سمجھتے ہیں۔ اور اسی کو اپنی تہذیبی شناخت تصوّر کرتے ہیں"۔

یہ باتیں سُن کر میرے دل میں اُن سے ملنے اور باتیں کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔

چنانچہ ہم لوگوں نے اُن کا پیچھا کیا، اور ایک دوکان میں انہیں جالیا۔

ملک بشیر الرحمٰن نے اُن سے میرا تعارف کروایا اور کہا کہ "یہ ڈاکٹر عبادت صاحب ہیں۔ اورینٹل کالج میں اُردو کے استاد ہیں۔ میں ان کا شاگرد ہوں۔ مجھ پر بہت شفقت فرماتے ہیں۔ آپ کو یہاں دیکھا تو آپ سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس لئے آپ کو دیکھ کر ہم لوگ آپ کے پیچھے پیچھے یہاں آگئے۔ اس "دخل درمعقولات کے لئے میں معذرت خواہ ہوں"۔

ڈاکٹر نذیر احمد بہت اچھی طرح محبت سے ملے" کہنے لگے ملک صاحب! میں غائبانہ طور پر عبادت صاحب کو جانتا ہوں۔ ان کے مضامین پڑھے ہیں۔ میں سائنس کا اُستاد ہوں لیکن ادب سے بھی مجھے دلچسپی ہے"۔ آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے ان سے ملاقات کا موقع فراہم کیا۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ راہ چلتے ایسے حضرات سے مُلاقات ہو جائے"۔

میں نے کہا "صوفی تبسم صاحب، ڈاکٹر تاثیر صاحب اور فیض صاحب نے اکثر آپ کا ذکر کیا ہے، اور آپ کے بارے میں بہت کچھ مجھے بتایا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ آج آپ سے سرِ راہے ہی سہی، مُلاقات ہوگئی۔ آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا"۔

ڈاکٹر صاحب کھڑے کھڑے اس دوکان پر ہم لوگوں سے خاصی دیر تک بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔ اُن سے مل کر جی خوش ہوا۔ طبیعت بشاش ہوئی۔ نذیر صاحب کی سادگی، بے تکلفی اور شائستگی نے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا، اور میں تقریباً چالیس سال تک اُن کی دلکش شخصیت کی ان خصوصیات کا والہ وشیدا رہا۔ بڑے ہی مخلص دوست ثابت ہوئے۔

خاصے عرصے تک وہ پنجاب کے مختلف گورنمنٹ کالجوں میں پرنسپل اور پروفیسر رہے۔ لیکن اکثر لاہور آتے رہتے تھے۔ یہاں اُن کے پاس وقت کم ہوتا تھا، لیکن وہ اورینٹل کالج میں آکر جھانکتے ضرور تھے۔ میں لیکچر روم میں ہوتا تو کسی کو یہ بتا کر چلے جاتے تھے کہ عبادت صاحب لیکچر سے فارغ ہوں تو کہہ دینا ڈاکٹر نذیر احمد آئے تھے، اور اگر میں اپنے کمرے میں ہوتا تو اطمینان سے بیٹھتے، چائے پیتے، باتیں کرتے، کالج کا حال احوال پوچھتے، اور

ادبی موضوعات پر دلچسپ باتیں کرتے۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ بیٹھ کر وہ یہ کہہ کر رُخصت ہوتے کہ کام بہت ہیں، اور وقت کم ہے۔ جی چاہتا تھا آپ کے ساتھ زیادہ وقت گذاروں۔ ادبی لوگوں کے ساتھ میرا جو وقت گذرتا ہے، وہ میری زندگی کا بہترین وقت ہوتا ہے۔ پیشے کے اعتبار سے میں سائنٹسٹ ہوں لیکن ادب اور آرٹ پر باتیں کرنے میں مجھے بہت لطف آتا ہے۔ میرے خوش گوار ترین لمحے وہ ہوتے ہیں جو ادیبوں کی صحبتوں میں گذرتے ہیں۔"

چند سال بعد ڈاکٹر نذیر احمد پروفیسر اور پرنسپل کی حیثیت سے گورنمنٹ کالج لاہور میں آگئے اب اُن سے زیادہ ملاقاتیں ہونے لگیں۔ اس زمانے میں اُن کے پاس ایک اسپورٹ سائیکل تھی وہ اس پر بیٹھ کر تقریباً روزانہ اورینٹل کالج آتے تھے، اور اپنی اس سائیکل، بڑے بڑے اُلجھے ہوئے بالوں اپنے سادہ لباس اور اپنے بے تکلف لیکن مہذب انداز گفتگو سے پہچانے جاتے تھے۔ چپراسیوں، طالب علموں، پروفیسروں سب سے اُن کی جان پہچان تھی، اور وہ ان سب سے دوستوں کی طرح پیش آتے تھے۔ اورینٹل کالج میں ہر شخص اُن کی عزت کرتا تھا، اور وہ ہر ایک کے دوست تھے۔

انگریزوں کے زمانے میں گورنمنٹ کالج اور اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپلوں کو بہت بڑا سرکاری افسر تصور کیا جاتا تھا۔ کوئی نوٹس دفتر کی طرف سے جاری ہوتا تھا تو نیچے کی طرف کاغذ پر لکھا جاتا تھا "بحکم جناب پرنسپل صاحب بہادر"۔ آزادی کے بعد بھی کچھ عرصے تک یہ روایت باقی رہی۔ بالآخر اورینٹل کالج سے تو اس کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن گورنمنٹ کالج کے پرنسپل کے رعب اور دبدبے کی یہ کیفیت خاصے عرصے تک قائم رہی۔ لیکن جب ڈاکٹر نذیر احمد اس کالج کے پرنسپل ہوئے تو اُن کے درویشانہ مزاج اور سادگی کی کیفیت نے اس ماحول کو ختم کر دیا۔ اُن سے قبل پرنسپل سے طالب علموں کا ملنا جوئے شیر کے لانے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنے دروازے طالب علموں کے لئے کھول دیئے۔

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب طالب علموں سے اپنے بچوں کی طرح برتاؤ کرتے تھے۔ اُن سے گھُل مِل جاتے تھے۔ اُن سے بغیر کسی پابندی کے بے تکلفی کے ساتھ ملتے تھے۔ اُن

کے مسائل کو سنتے اور ذاتی طور پر اُن میں دلچسپی سے کہ اُن کو حل کر دیتے تھے۔ اس رویے نے انہیں ہر دلعزیز پرنسپل بنا دیا۔ طالب علم اُن سے والہانہ انداز میں محبت کرنے لگے۔ لیکن اُن کی عزت اور احترام میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ اس میں تو اضافہ ہوا۔ وہ طالب علموں سے خاصے بے تکلف تھے، لیکن ان کی اس بے تکلفی سے وہ کوئی غلط فائدہ نہیں اٹھاتے تھے، اور ہمیشہ اپنے حدود میں رہتے تھے۔ اس ماحول کی وجہ سے اُن کا انتظامی کاروبار بخیر و خوبی چلتا تھا۔

اپنی پرنسپلی کے زمانے میں ڈاکٹر صاحب نے صحیح اکیڈمک ماحول پیدا کیا۔ اُستادوں اور طالب علموں میں علم و ادب سے دلچسپی پیدا کی۔ اور گورنمنٹ کالج کو اچھا خاصا علمی ادبی مرکز بنا دیا۔ وہ کالج کی ہر انجمن اور ہر سوسائٹی کے جلسوں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے، اور اس کی وجہ سے انجمنیں اور سوسائٹیاں خاصی فعال ہو گئی تھیں۔ کھیلوں میں بھی وہ دلچسپی لیتے تھے، اور کھلاڑیوں کی مختلف طریقوں سے ہمت افزائی کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی پرنسپلی کا زمانہ اس اعتبار سے بھی گورنمنٹ کالج لاہور کا زرین دور تھا۔

ڈاکٹر نذیر احمد نے کبھی کار نہیں رکھی۔ اُن کے پاس ایک سائیکل تھی، اور وہ اس سائیکل پر بڑی بے تکلفی سے جہاں چاہتے تھے، اطمینان سے چلے جاتے تھے۔ انہیں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ سائیکل کا استعمال گورنمنٹ کالج کے پرنسپل کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اپنی اس سائیکل سے وہ پہچانے جاتے تھے۔ اس سائیکل پر وہ کبھی سکریٹریٹ جاتے، کبھی ایجوکیشن کے دفتر کا چکر لگاتے، کبھی یونیورسٹی کے دفتر میں پہنچتے، کبھی اورینٹل کالج میں آتے، کبھی بازاروں میں نکل جاتے — غرض دن بھر وہ اس سائیکل پر رواں دواں رہتے تھے۔ میں نے لاہور میں صرف دو پرنسپل ایسے دیکھے جنہوں نے سائیکل کو کبھی خیرباد نہیں کہا۔ ایک تو ایم۔ اے او کالج کے پرنسپل اور مشہور کرکٹر پروفیسر دلاور حسین اور دوسرے گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر نذیر احمد!

اُس زمانے میں سائیکل کا عام رواج تھا — کالجوں کے اساتذہ تو زیادہ تر سائیکل ہی استعمال کرتے تھے لیکن پرنسپلوں کے بارے میں کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ

سائیکل استعمال کریں گے، ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنی سادگی سے اس تصور کو پاش پاش کر دیا۔ وہ بڑی بے باکی اور بغیر کسی اُلجھن کے سواری کے لئے سائیکل استعمال کرتے تھے۔ طالب علم انہیں سائیکل پر جاتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتے، اور آپس میں یہ باتیں کرتے تھے کہ دیکھو ہمارا عظیم پرنسپل جا رہا ہے۔ ہمارا درویش پرنسپل رواں دواں ہے وہ کسی قسم کے False Sense of Prestige میں مبتلا نہیں۔ اور اسی میں اُس کی بڑائی ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد واقعی ایک عظیم شخصیت کے مالک ہیں۔"

ڈاکٹر نذیر کی پرنسپلی کے زمانے میں گورنمنٹ کالج میں سیاست والوں کی دال نہیں گلی۔ وہاں کا ماحول صحیح رہا۔ لیکن یونیورسٹی کے کالجوں اور تدریسی شعبوں میں سیاست والوں نے طالب علموں کو خوب خوب استعمال کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی ہنگامے معمول کی بات بن گئے۔ اس کا کچھ اثر اورینٹل کالج پر بھی ہوا۔ میں اُس زمانے میں شعبۂ اُردو کا صدر اور کالج کا پرنسپل تھا اگرچہ میری انتظامی حکمت عملی کی وجہ سے کالج کے اندر تو فضا سازگار رہی لیکن باہر کے لوگ کالج کے لئے خطرہ بنے رہے۔ یہ اور بات ہے کہ انہیں اپنے مذموم مقاصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔

لیکن ڈاکٹر نذیر احمد کو یونیورسٹی کی سیاسی صورت حال کی نزاکت کا احساس تھا۔ اس لئے وہ تقریباً روزانہ میرے پاس اورینٹل کالج میں آتے تھے۔ حال احوال پوچھتے تھے۔ خیریت معلوم کرتے تھے اور مجھے مفید مشورے دیتے تھے۔ نذیر صاحب بڑے ہی جہاں دیدہ اور تجربہ کار آدمی تھے۔ لاہور کے تعلیمی ماحول میں اُن کا اثر بھی بہت تھا۔ اس لئے حالات کو معمول پر رکھنے میں اُن کے مشورے ہمیشہ میرے لئے مفید ثابت ہوئے۔ اُن کی اخلاقی مدد ہمیشہ میرے شامل حال رہی، اور میں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں پوری طرح کامیاب رہا۔ ہمارے کالج میں بعض ایسے رفقا بھی تھے جنہیں نادان دوست کہنا چاہیئے۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی بصیرت اور فراست، بے باکی اور بے تکلفی کی بدولت اِن نادان دوستوں کا کوئی تیر نشانے پر نہ لگا، اور وہ ذلیل و رُسوا ہو کر ہمیشہ شرمندہ ہوئے۔

ڈاکٹر نذیر احمد اورینٹل کالج کے معاملات میں اتنی دلچسپی اس لئے لیتے تھے کہ

وہاں کا ماحول علمی اور ادبی تھا، اور وہ چاہتے تھے کہ یہ ماحول کسی طرح مجروح نہ ہو۔ وہ اورینٹل کالج کے بعض پروفیسروں سے علمی استفادہ بھی کرتے تھے۔ فارسی کے پروفیسر سید وزیر الحسن عابدی صاحب کے پاس تو وہ اکثر بیٹھے ہوئے نظر آتے تھے۔ عابدی صاحب کے گھر پر بھی، علمی استفادے کی غرض سے اُن کا آنا جانا تھا۔ مجھ سے تو اُن کی دوستی اور بے تکلفی تھی۔ اس لئے مجھ پر تو اُن کی شفقت بے پایاں تھی۔

گورنمنٹ کالج سے ریٹائر ہونے کے بعد تو اورینٹل کالج سے اُن کا رابطہ کچھ زیادہ ہی اُستوار ہو گیا۔ اورینٹل کالج اس زمانے میں صرف ایک تعلیمی ادارہ ہی نہیں رہا تھا ایک ادبی مرکز بھی بن گیا تھا۔ پاکستان، ہندوستان، افغانستان، ایران، فرانس، جرمنی، اٹلی، ترکی، انگلستان روس اور امریکہ سے عالم اور ادیب اورینٹل کالج میں آتے رہتے تھے۔ روزانہ کوئی نہ کوئی جلسہ یا لیکچر ضرور ہوتا تھا۔ ڈاکٹر نذیر احمد اِن جلسوں میں نہ صرف شرکت کرتے تھے، بلکہ اِن جلسوں کو ترتیب دینے میں مختلف طریقوں سے ہماری مدد بھی کرتے تھے۔ اورینٹل کالج کے علمی ادبی ماحول کی وجہ سے اس ادارے، اور اس کے ارباب اختیار کے ساتھ اُن کا خلوص بے اندازہ تھا۔ اکثر مختلف محفلوں میں، مختلف لوگوں سے باتیں کرتے ہوئے وہ یہ کہتے سُنے جاتے تھے کہ علمی ادبی اعتبار سے اورینٹل کالج کا کوئی جواب نہیں۔ میں جب اورینٹل کالج میں جاتا ہوں تو آکسفورڈ کیمرج لندن کی یاد میرے دل میں تازہ ہو جاتی ہے۔ اس تعلیمی ادارے نے اُنہیں روایات کو برقرار رکھا ہے جو انگلستان کی یونیورسٹیوں کے ساتھ مخصوص ہیں، اور جن سے وہ پہچانی جاتی ہیں۔

شاید یہی وجہ ہے کہ جب میں نے ۷۳-۱۹۷۲ء کے تعلیمی سال میں اورینٹل کالج کا جشنِ صد سالہ منانے کا ڈول ڈالا تو ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے اس کی منصوبہ بندی میں میرے دستِ راست کی حیثیت سے کام کیا۔ نذیر احمد صاحب اس زمانے میں روزانہ کالج آتے تھے، اور کام کی رفتار کا جائزہ لیتے تھے۔ مختلف کمیٹیوں میں کئی کئی گھنٹے تک شرکت کرتے تھے، ہم لوگوں کو مفید مشورے دیتے تھے اور دامے، درمے، سخنے، ہر طرح کی مدد کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ اس اہم کام میں اگر ڈاکٹر نذیر احمد،

پروفیسر خواجہ صلاح الدین ڈائرکٹر کیمیکل ٹیکنالوجی، پنجاب یونیورسٹی، ڈاکٹر رانا احسان الٰہی پروفیسر عربی اورینٹل کالج، پروفیسر سید وزیرالحسن عابدی پروفیسر فارسی اورینٹل کالج اور شعبۂ اُردو کے اساتذہ ڈاکٹر عُبیداللہ خاں، ڈاکٹر ناظر حسن زیدی اور ڈاکٹر سُہیل احمد خاں کا تعاون مجھے حاصل نہ ہوتا تو اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ کی تقریبات کے عظیم منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں مجھے خاطر خواہ کامیابی نہ ہوتی۔ یہ انہیں دوستوں کی ہمت افزائی تھی کہ میں نے اس موقع پر مشرقی علوم کی ایک بین الاقوامی کانفرنس کا ڈول ڈالا جس میں دنیا کے تقریباً تمام اہم ملکوں کے اسکالر اور پروفیسر شریک ہوئے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے اس کانفرنس کو کامیاب بنانے میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ خاص طور پر اس کانفرنس کی رُوداد اور مقالات کو زیورِ طباعت سے آراستہ کرنے کا سہرا بنیادی طور پر انہیں کے سر ہے۔

کتابوں کی طباعت میں سب سے بڑا مسئلہ کاغذ کا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اس لئے ایک دن جب ہم لوگ جشن صد سالہ کی رُوداد کو چھاپنے کے مسائل پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے تو ڈاکٹر نذیر نے مجھ سے کہا "ان کتابوں کی طباعت پر تو زرِ کثیر صرف ہوگا۔ کاغذ تو بہت مہنگا ہے اور نایاب بھی ہے۔ آپ اتنا سرمایہ کہاں سے لائیں گے؟ یونیورسٹی تو دے گی نہیں! ـــ کاغذ کہاں سے آئے گا؟"

میں نے کہا یونیورسٹی اس کے لئے ایک پیسہ دینے کو تیار نہیں"

لیکن ڈاکٹر صاحب نے ایک لمحے میں اس مسئلے کو حل کیا۔

کہنے لگے "کاغذ کا انتظام ہو جائے گا۔ میں پیکیجز کے ڈائرکٹر سید بابر علی شاہ صاحب سے کہوں گا۔ لیکن اس کام کے لئے ہم لوگوں کو اُن سے ملنا پڑے گا۔ جتنا اور جس قسم کا کاغذ آپ کو درکار ہو، اس کی تفصیل ایک کاغذ پر نوٹ کر لیجیے"۔

چنانچہ ایک دن نذیر احمد صاحب مجھے پیکیجز کے دفتر لے گئے۔ سید بابر علی شاہ سے ملاقات کرائی۔ وہ بہت اچھی طرح ملے۔ نہایت مہذب، شائستہ اور مخلص اور علم دوست انسان نظر آئے۔ اُنہوں نے اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ کی تقریبات اور علوم مشرقی کی بین الاقوامی کانفرنس کا حال احوال سُنا۔ خوش ہوئے۔

اور پوچھا آپ کو کس کس قسم کے کتنے کاغذ کی ضرورت ہے"؟
میں نے تفصیل بیان کی، اور جس کاغذ پر یہ تفصیل لکھی تھی وہ انہیں دے دیا۔ بابر علی شاہ صاحب دیر تک دلچسپ باتیں کرتے رہے۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد ہم لوگوں نے اُن سے اجازت لی۔

اس ملاقات کے بعد تیسرے دن ڈاکٹر نذیر احمد پیکیجز کی ایک ویگن میں اورینٹل کالج آئے۔ اس میں مختلف قسم کا کاغذ بھرا ہوا تھا۔ یہ بابر علی شاہ صاحب کی طرف سے اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ کے مقالات کے لئے ایک عطیہ تھا۔

میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔ کاغذ کو کالج میں محفوظ کروایا، اور جشن صد سالہ کی روداد اور مقالات کی کئی ضخیم جلدیں چھاپنے کے لئے اس کو استعمال کیا۔ یہ خوبصورت اور وزنی جلدیں دنیا کی تمام اہم یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں میں گئیں، اور اب خاصی تعداد میں اس کے نسخے اورینٹل کالج میں اُن شاندار الماریوں میں محفوظ ہیں جو میں نے اپنے خرچ پر خاص طور پر اسی مقصد کے لئے بنوائی تھیں۔

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو اِن ضخیم جلدوں کی طباعت و اشاعت خواب و خیال ہی رہتی، اور جو علمی کارنامہ جشن صد سالہ کی بین الاقوامی کانفرنس نے انجام دیا تھا، اس کا کسی کو علم تک نہ ہوتا۔ ان خوبصورت جلدوں کا کاغذ اتنا اچھا تھا، اور یہ اس قدر خوبصورت چھپی تھیں کہ ساری دنیا کے تعلیمی اور تحقیقی اداروں نے اِن کو سراہا۔

گورنمنٹ کالج سے ریٹائر ہونے کے بعد ڈاکٹر نذیر احمد پیکیجز میں چلے گئے تھے، اور علمی کاموں میں ان لوگوں کی مدد کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی اس پوزیشن سے فائدہ اُٹھایا، اور اورینٹل کالج کے لئے اور ذاتی طور پر میرے لئے ایک فرشتۂ رحمت ثابت ہوئے۔ ڈاکٹر نذیر احمد اخلاق کا پیکر تھے، اور علمی، ادبی اور تہذیبی کاموں میں ہمیشہ گہری دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔ اُن کے احسانات مجھ پر اور اورینٹل کالج پر بے شمار ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ ہم لوگوں کو اپنے خلوص اور محبت سے نوازا۔ ہم لوگوں کو ہمیشہ

اُن کی وجہ سے ڈھارس سی رہتی تھی۔ وہ ہم لوگوں کے بہی خواہ تھے، اور ہمارا ہر کام کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔

ڈاکٹر نذیر احمد سائنس کے پروفیسر تھے لیکن اُن کا مزاج علمی اور ادبی تھا۔ اس لئے وہ علمی ادبی کاموں میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ انہیں مشرقی زبانوں کے ادبیات کے مطالعے کا شوق تھا اور اس شوق ہی نے اُن سے علمی ادبی کام بھی کروایا۔ فارسی، اُردو اور پنجابی پر اُن کی گہری نظر تھی۔ انہوں نے مختلف قسم کے ادبی کام کئے لیکن بابا بُلھے شاہ کا پنجابی کلام انہوں نے جس محنت اور جاں فشانی سے مُرتب کر کے شائع کیا، اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ اس کام کے سلسلے میں وہ ہندوستان بھی گئے، اور وہاں کی لائبریریوں میں بیٹھ کر کام کیا۔ چنانچہ بابا کے کلام کا ایک اہم مجموعہ مُرتّب ہوا۔ اور پیکجز لمیٹڈ نے اس کو بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کر کے ایک اہم ادبی خدمت انجام دی۔

بظاہر دیکھنے میں ڈاکٹر نذیر احمد لاپروا اور بے قاعدہ سے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ لیکن اُن کی شخصیت میں بڑی ہی باقاعدگی تھی۔ وہ اپنے لباس کا بہت کم خیال رکھتے تھے۔ اُن کے سر کے بال بڑھے رہتے تھے مہینوں اُن کو کٹوانے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ اُن کا لباس بھی بہت سادہ ہوتا تھا۔ آرائش و زیبائش کا خیال اُن کے ہاں نام کو بھی نہیں تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک درویش تھے، اور واقعی درویشوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور شاید اسی درویشی کی وجہ سے اُن کی شخصیت میں ایک عجیب طرح کی جاذبیت تھی۔ جو شخص بھی اُن سے ملتا تھا، اور اُن کے قریب ہو جاتا تھا، اُن کی شخصیت کی یہ جاذبیت اس کو اپنی طرف کھینچتی تھی، اور وہ اُن کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔

وہ کبھی کسی کی بُرائی نہیں کرتے تھے۔ ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرتے تھے۔ عفو و درگذر سے کام لینا اُن کا مزاج تھا۔ وہ ہر ایک کو مجبور اور معذور سمجھ کر معاف کر دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا دشمن کوئی نہیں تھا۔ وہ ایک پاک صاف آدمی تھے۔ نرم

دلی اُن کی نمایاں ترین خصوصیت تھی۔ بڑے آدمی کو بھی وہ تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ خدمتِ خلق اُن کا نصب العین تھا۔ وہ دوسروں کے لئے زندہ رہے۔ لوگوں کی خدمت کرتے رہے، اور زندگی بھر انہوں نے اپنے دوستوں، عزیزوں اور عام لوگوں کو آرام پہنچانے اور ان کو سکون و اطمینان کی دولتِ بیش بہا سے ہم کنار کرنے کے کاروبار میں اپنے آپ کو مصروف رکھا، اور اس طرح وہ خود طمانیت قلب کی دولت بیش بہا سے مالا مال رہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد ہمیشہ خوش رہتے تھے، لیکن جب کہیں انسانیت، تہذیب اور اخلاق کی قدروں کو مجروح ہوتے دیکھتے تو وہ اُداس ہو جاتے تھے، اور اُداسی کی یہ تاریکی اُن کی شخصیت کے اُفق پر مہینوں بلکہ برسوں چھائی رہتی تھی۔ حساس اور جذباتی آدمی تھے۔ اس لئے کبھی کوئی ناخوش گوار واقعہ ہو جائے تو اُن پر اس کا بہت اثر ہوتا تھا۔

اُن کی پرنسپلی کے زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس کا اثر اُن پر برسوں رہا۔ ہوا یوں کہ اُن کے کالج کے ایک سینئر پروفیسر علامہ اقبالؒ پر لیکچر دینے کے لئے اورینٹل کالج آتے تھے۔ اُس زمانے کے دو ایک طالب علموں نے بعض شر پسندوں کے اشارے پر یہ بے بنیاد الزام لگایا کہ وہ علامہ اقبالؒ کے خیالات و نظریات کی نفی کرتے ہیں، اور یہ خبر کسی اخبار میں بھی چھپوا دی، جس کے نتیجے میں اُن کا تبادلہ لاہور سے کسی دور اُفتادہ مقام پر کر دیا گیا۔ پروفیسر صاحب اس واقعے سے ایسے بد دل ہوئے کہ اُنہوں نے اپنی بیس سال کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا، اور بیکاری کی زندگی بسر کرنے لگے۔

ڈاکٹر نذیر احمد پر اس واقعے کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے پروفیسر صاحب سے اظہار ہمدردی کیا، اور کہا کہ "سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، آپ استعفیٰ واپس لے لیجیے"، لیکن اس بلند مرتبہ اُستاد کے لئے یہ صدمہ اتنا شدید تھا کہ وہ اس کے لئے آمادہ نہ ہوئے، اور یہ کہہ کر ڈاکٹر نذیر احمد سے معذرت کی کہ "میں ایسے ماحول میں ملازمت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں جس میں طالب علم

اُستاد کی توہین کریں اور بعض شرپسندوں کا آلۂ کار بن کر غلط اور بے بنیاد الزام لگائیں، میں بے عزتی کی ملازمت پر بیکاری کی زندگی کو ترجیح دیتا ہوں"۔

اس واقعے کی وجہ سے ڈاکٹر نذیر احمدؒ اُداس رہنے لگے۔ ہر محفل میں، ہر شخص سے اس واقعے کا ذکر کرکے افسوس کا اظہار کرتے تھے۔ کئی بار تو میں نے اُن کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ جو اکثر چھلک کر نوجوانوں کی بے راہ روی، انتظامیہ کی سفاکی اور اربابِ اختیار کی نادانی کا مرثیہ رقم کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔

ڈاکٹر نذیر احمدؒ نے اس پروفیسر کو اپنے کالج سے آنسوؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ کالج میں اُن کے اعزاز میں ایک الوداعی تقریب مُنعقد کی، اور اس موقع پر انتہائی جذباتی انداز میں ایک ایسی تقریر کی کہ حاضرین میں سے ہر ایک پر رقت طاری ہو گئی۔ وہ خود بھی روئے اور انہوں نے دوسروں کو بھی رُلایا۔

میں اس دلدوز منظر کو کبھی بھول نہیں سکتا۔

ڈاکٹر نذیر احمدؒ اخلاص کا پیکر تھے۔ محبت کا مجسمہ تھے۔ انسانیت اور شرافت کا نمونہ تھے۔ وہ کسی انسان کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھنا اُن کا نصب العین تھا۔ روشن خیالی اخلاص اور تہذیب و شائستگی تو گویا اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔ وہ خدمت کے جذبے سے سرشار تھے، اور اپنے فکر و عمل سے ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کے خواہش مند تھے جس میں نوجوان محبت تہذیب و شائستگی کے جذبات عالیہ سے سرشار اور بزرگ فراست و دانش مندی اور معاملہ فہمی کی اعلٰی ترین اقدار کے علم بردار ہوں۔

میں نے ڈاکٹر نذیر احمدؒ کی دلکش و دلآویز شخصیت میں فرشتوں کی سی خصوصیات دیکھیں، اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ انسان کے روپ ایک فرشتہ تھے۔

پروفیسر خواجہ صلاح الدین

پنجاب یونیورسٹی میں کیمیکل ٹیکنالوجی کے پروفیسر اور انسٹی ٹیوٹ آف کیمیکل ٹیکنالوجی کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ صلاح الدین ایک عظیم انسان، ایک مخلص دوست ایک معروف ماہر تعلیم، ایک منفرد منتظم، ایک نامور سائنس دان اور عربی، فارسی، اُردو اور اسلامی علوم کے ایک مشہور عالم تھے۔ ایک انسان میں اتنی خوبیوں کا امتزاج ذرا کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد جب میں پنجاب یونیورسٹی میں آیا تو اُن سے میری ملاقات ہوئی۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب پنجاب یونیورسٹی اکیڈمک اسٹاف ایسوسی ایشن کے صدر یا سیکرٹری تھے اور ایسوسی ایشن کے معاملات میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ اساتذہ کے معاملات و مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اُن کی عزت اور احترام کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اور سال میں کئی بار اُن کے لئے نہایت پُرتکلف عشائیہ کا اہتمام کرتے تھے۔

میری اُن سے پہلی ملاقات اسی عشائیے کے موقع پر ہوئی۔ میں ڈنر میں شرکت کے لئے چند منٹ پہلے پہنچا تو دیکھا ایک صاحب شلوار قمیص میں ملبوس انتظامات میں مصروف ہیں۔ دراز قد، بھاری بھرکم جسم، گول بھرا بھرا چہرہ، سرخ سفید رنگ، آواز میں گرج دار کیفیت

یہ پروفیسر خواجہ صلاح الدین تھے۔

میں اُن کے قریب گیا۔ اپنا تعارف کرایا، انہیں بتایا کہ میں اورنیٹل کالج کے اسٹاف میں ایک نیا اضافہ ہوں۔ خواجہ صاحب بڑے تپاک سے ملے۔ معانقہ کیا، اور انتظامات کے کام کو چھوڑ کر مجھ سے باتیں کرنے لگے۔

کہنے لگے "آپ سے غائبانہ تعارف تھا۔ میرا پیشہ تو سائنس اور ٹیکنالوجی ہے لیکن مجھے ادب سے بھی دلچسپی ہے۔ مختلف رسائل میں آپ کے مضامین پڑھے ہیں۔ آپ سے ملنے کی خواہش تھی۔ شکر ہے کہ آج یہ خواہش پوری ہوگئی۔ میں آپ کو پنجاب یونیورسٹی میں خوش آمدید کہتا ہوں"۔

میں نے کہا "احباب سے آپ کے بارے میں بہت کچھ سُنا تھا، اور آپ کی شخصیت کے اس پہلو میں مجھے گہری دلچسپی تھی کہ آپ سائنس کے پروفیسر ہونے کے باوجود مشرقی علوم اور ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ سے آج میری مُلاقات ہوگئی"۔

دیر تک ہم لوگ مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے، اور اُن سے باتیں کر کے مجھے یہ احساس ہوا کہ خواجہ صاحب محبت اور خلوص کا پیکر ہیں۔ ہمدردی اور دلسوزی کا مجسمہ ہیں۔ تہذیب و شائستگی کی ایک بادِ نوبہار ہیں۔

اور اس احساس ہی نے میری اُن سے اس ملاقات کو دوستی میں تبدیل کر دیا۔ پچیس تیس سال مجھے یونیورسٹی میں اُن کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، اور اُن کی دلکش اور باغ و بہار شخصیت ہمیشہ میرے لئے ایک ہوائے سبک خرام بن کر مسرت و انبساط کا سامان پیدا کرتی رہی۔

خواجہ صاحب یونیورسٹی کے معاملات میں ہمیشہ گہری دلچسپی لیتے تھے۔ وہ یونیورسٹی کے نظام کی آزادی اور اس کے اساتذہ کے احترام کے قائل تھے۔ یونیورسٹی کے معاملات میں بیوروکریسی کے دخل در معقولات کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اس سے یونیورسٹی کی آزادی مجروح ہوتی ہے۔ وہ بڑے افسوس

کے ساتھ اس کا اظہار کرتے تھے کہ بیوروکریٹ یونیورسٹی کو اپنے ماتحت سمجھتے ہیں،
اور اس سے بھی زیادہ اُن کے نزدیک افسوس کی بات یہ تھی کہ یونیورسٹی کی انتظامیہ
اور خصوصاً اُس کے بعض سربراہ اپنا مطلب نکالنے کے لئے بیوروکریسی کی
خوشامد کرتے ہیں۔ اُن کے خیال میں یہ بہت بڑا المیہ تھا۔

بات یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے یورپ اور انگلستان کی یونیورسٹیوں میں تعلیم
حاصل کی تھی اور وہاں کے نظام کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اُن کی یہ خواہش تھی
کہ وہاں جو آزادی اور عزتِ نفس کا خیال ہے وہ پاکستان کی یونیورسٹیوں میں بھی پیدا
ہو۔ اُنہوں نے اس ماحول کو پیدا کرنے کے لئے اپنی سی پوری کوشش کی، اور انہیں
اس میں خاصی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس نظام کو نہ بدل
سکے جو حکومتوں نے وطنِ عزیز میں قائم کیا تھا، اور جس میں یونیورسٹیاں سرکاری افسروں
کی دستِ نگر بن کر رہ گئی تھی۔

خواجہ صاحب کا زیادہ وقت یونیورسٹی میں گذرتا تھا۔ صبح کو وہ اپنے شعبے میں آجاتے
تھے، اور رات تک یہیں رہتے تھے۔ یہیں وہ پڑھاتے تھے، یہیں انتظامی کام کرتے
تھے، یہیں ملاقات کے لئے آنے والے لوگوں سے ملتے تھے۔ یہیں سائنس کے تجربات
کرتے تھے۔ یہیں پڑھتے لکھتے تھے۔ یہیں وہ عربی فارسی اُردو اور اسلامیات کی کتابوں
کا مطالعہ کرتے تھے۔ اُن کے پاس وقت بہت تھا۔ گھریلو زندگی کے بکھیڑوں سے
اُنہوں نے اپنے آپ کو آزاد رکھا تھا۔ انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ بیوی بچوں
کے جنجال میں نہیں پھنسے تھے۔ اس لئے اپنی جائے قیام پر صرف رات کو سونے
کے لئے جاتے تھے۔ صبح سے شام تک اُن کا وقت اپنے شعبے میں گذرتا تھا۔ کوئی
اور دلچسپی اُن کی زندگی میں نہیں تھی۔

مشرقی علوم سے انہیں جو دلچسپی تھی، اُس کے پیشِ نظر وہ اورینٹل کالج کے
معاملات میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ وہ اورینٹل کالج کمیٹی کے ممبر تھے۔ اُن کی خواہش
تھی کہ اورینٹل کالج کی قدیم روایت یونیورسٹی میں زندہ و تابندہ رہے۔ اس کے لئے

وہ برابر کوشش کرتے رہتے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ کے ممبر کی حیثیت سے وہ اورینٹل کالج کے معاملات و مسائل کو ہمیشہ نہایت خوش اسلوبی سے سلجھانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ اورینٹل کالج میں مختلف زبانوں کے زیادہ سے زیادہ پروفیسر ہوں جو تدریس کے ساتھ تحقیق کا اعلےٰ درجے کا کام کریں۔ چنانچہ انہوں نے کئی نئے پروفیسروں کی آسامیاں اورینٹل کالج میں قائم کروائیں، اور اُن کے تحقیقی کاموں میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔

میری پرنسپلی کے زمانے میں یونیورسٹی کی انتظامیہ نے بین الاقوامی شہرت کے اس ادارے کا جشن صد سالہ منانے کا فیصلہ کیا۔ تو جشن صد سالہ کمیٹی کے ایک ممبر کی حیثیت سے خواجہ صاحب نے بعض ایسے کام کئے جو ہم لوگوں میں سے کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔

جشن صد سالہ منانے کے لئے یونیورسٹی نے صرف پچیس ہزار روپے کی رقم منظور کی تھی۔ اس میں سے کوئی بارہ ہزار روپے کی رقم تحقیقی کتابوں کی طباعت و اشاعت پر خرچ ہو چکی تھی۔ اب صرف بارہ ہزار روپے ہمارے پاس رہ گئے تھے۔ اور ہمارا منصوبہ یہ تھا کہ جشن صد سالہ کے موقع پر مشرقی علوم کے ماہرین کی ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی جائے جس میں دُنیا کی تمام اہم یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں کے پروفیسر اور اسکالر شریک ہوں، اپنے تحقیقی مقالے پڑھیں اور اورینٹل کالج کو خراج تحسین پیش کریں۔ یہ کام ظاہر ہے کہ دس بارہ ہزار روپے میں نہیں ہو سکتا تھا۔ یونیورسٹی اس سے زیادہ رقم دینے کے لئے تیار نہیں تھی۔ چنانچہ جب جشن صد سالہ کمیٹی کی میٹنگ میں اس پر غور کیا گیا تو خواجہ صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ اس کے لئے شہر کے مختلف لوگوں کے پاس جا کر عطیہ وصول کیا جائے۔ چنانچہ وہ خود بعض مخیّر حضرات کے پاس گئے اور اُن سے اس علمی کام کے لئے عطیہ طلب کیا، اور اس میں انہیں خاصی حد تک کامیابی ہوئی۔ اس طرح ہمارا کام چل نکلا۔ حکومت نے بھی ہماری کچھ مدد کی اور مشرقی علوم کی بین الاقوامی کانفرنس کے مختلف مراحل

نہایت خوش اسلوبی سے طے پا گئے۔ خواجہ صاحب کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو شاید یہ کانفرنس کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکتی۔ خواجہ صاحب کی کوششوں سے یہ کانفرنس ہوئی اور ایسی کامیاب ہوئی کہ لوگ اس کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس کی رپورٹ، جو میں نے پرنسپل کی حیثیت سے کئی جلدوں میں شائع کی، اُس سے اس کانفرنس کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ خواجہ صاحب کی غیر معمولی دلچسپی شامل حال نہ ہوتی اور وہ اس سلسلے میں ہماری مدد نہ کرتے تو یہ کانفرنس اس طرح کامیابی سے ہم کنار نہ ہوتی۔

خواجہ صاحب مغرب کے تعلیم یافتہ تھے۔ خاصا عرصہ انہوں نے اپنی تعلیم کے سلسلے میں انگلستان اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں گذارا تھا لیکن اُن کا مزاج مشرقی تھا۔ اور مشرقی علوم سے انہیں دلچسپی تھی۔ انہوں نے عربی، فارسی اور اُردو کی کتابوں کا خاصا ذخیرہ جمع کیا تھا۔ اور ان کتابوں کا مطالعہ اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ سائنس کے تجربات وہ یونیورسٹی میں کرتے تھے لیکن گھر پر وہ عربی، فارسی اور اُردو کی کتابوں کے مطالعے میں مصروف رہتے تھے۔ اور جب بھی اورینٹل کالج میں آتے تھے تو وہ مشرقی علوم کے مختلف پہلوؤں پر نہایت عالمانہ گفتگو کرتے تھے۔ اورینٹل کالج کے عربی، فارسی اور اُردو کے پروفیسروں سے اُن کا رابطہ تھا۔ وہ اُن کے ساتھ خاصا وقت گذارتے تھے اور اُن کے تحقیقی کاموں میں گہری دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔ یونیورسٹی کی مختلف کمیٹیوں میں جب اورینٹل کالج کا کوئی معاملہ زیر بحث آتا تھا تو وہ ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ "اورینٹل کالج اس یونیورسٹی کی آبرو ہے۔ اپنے تحقیقی کاموں کی وجہ سے وہ ساری دنیا میں جانا پہچانا جاتا ہے، اور اس پر یونیورسٹی کو فخر کرنا چاہیئے۔"

پروفیسر صاحب نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اُن کا لباس مشرقی تھا۔ وہ ہمیشہ شلوار اور قمیص پہنتے تھے۔ سردیوں میں اس پر ایک معمولی سا سوئٹر، بنڈی یا شیروانی پہن لیتے تھے۔ بڑے بڑے جلسوں اور پارٹیوں تک میں اسی لباس میں چلے جاتے تھے۔ لیکچر بھی اسی لباس میں دیتے تھے۔ انگلستان کے دوران

قیام میں انہوں نے کبھی سوٹ پہنا ہوگا لیکن پاکستان کے قیام کے بعد انہوں نے کبھی مغربی لباس زیب تن نہیں کیا۔

میں نے ایک دن، ازراہ تفنن، اُن سے پوچھا "آپ نے سوٹ کتنے عرصے سے نہیں پہنا؟"

کہنے لگے "جب سے میں یورپ سے واپس آیا ہوں میں نے کوئی مغربی لباس نہیں پہنا۔ انگلستان میں مجبوراً پہن لیتا تھا۔ اس کی وجہ سردی کی شدت بھی تھی، اور کچھ جیسا دیس ویسا بھیس والا معاملہ بھی تھا۔ قومی لباس ہماری شناخت ہے مجھے اس میں آرام بھی بہت ملتا ہے۔"

میں نے کہا "کبھی کبھی تو مغربی لباس بھی پہن لیا کیجئے۔ آپ وجیہہ اور شاندار آدمی ہیں۔ آپ پر ضرور اچھا لگے گا۔"

کہنے لگے "قومی لباس میں مجھے زیادہ وجاہت نظر آتی ہے۔"

لیکن ایک دن میں نے اصرار کر کے ان کو لندن سے سلا ہوا سوٹ پہننے کے لئے مجبور کر ہی دیا۔

ہوا یوں کہ برٹش کونسل کی طرف سے کامن ویلتھ اسکالرشپ دینے کے لئے جو کمیٹی تشکیل دی گئی تھی خواجہ صاحب اور میں، دونوں اس کے ممبر تھے۔ میں نے خواجہ صاحب سے اصرار کیا کہ جس دن اس کمیٹی کی میٹنگ ہو، اور اس میں اسکالرشپ کے اُمیدوار آپ کے سامنے پیش ہوں اس دن آپ میری خاطر سوٹ پہن کر آیئے گا۔

چنانچہ انہوں نے میری بات مانی، اپنا نہایت خوبصورت سوٹ پہن کر آئے، اور مجھے وہ اس لباس میں بہت اچھے لگے۔

لیکن میٹنگ میں انہوں نے مجھ سے کئی بار کہا کہ "میں کسا کسایا بیٹھا ہوں۔ اب اس لباس کی مجھے عادت نہیں رہی۔ آج آپ کے کہنے سے، اور آپ کا دل رکھنے کے لئے میں نے یہ لباس پہن لیا ہے۔"

وہ دوستوں کی بات مان لیتے تھے، اور کبھی کسی کا دل نہیں توڑتے تھے۔
میرے لندن کے دوران قیام میں وہ ایک دفعہ کسی وفد کے ساتھ لندن آئے۔ اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں مجھے تلاش کیا۔ وہاں کسی نے بتایا کہ میں لیکچر کے بعد زیادہ وقت برٹش میوزیم کے شعبۂ مشرقی میں گذارتا ہوں۔ چنانچہ مجھے تلاش کرنے کے لئے وہاں پہنچے۔ اور بڑی محبت سے ملے۔ آج وہ نہایت عمدہ سوٹ پہنے ہوئے تھے اور نہایت وجیہہ اور شاندار نظر آرہے تھے۔
میں نے حال احوال دریافت کرنے کے بعد کہا آپ نے کس قدر خوبصورت سوٹ پہنا ہے، اور اس لباس میں آپ کتنے خوبصورت نظر آرہے ہیں۔ خدا نظر بد سے بچائے! مہ وشانِ کشور لندن کی خیر نہیں۔"
کہنے لگے "میاں! جیسا دیس ویسا بھیس والا معاملہ ہے۔ اسی لئے یہ سوٹ میں نے پہن لیا ہے۔ کچھ موسم کا بھی تقاضا ہے۔ یہاں سردی بہت ہے۔ مہ وشان کشور لندن اس کو کب اہمیت دیتی ہیں۔"
غرض دیر تک ہم لوگ برٹش میوزیم کے کینٹریا میں اس قسم کی دلچسپ باتیں کرتے رہے۔ اُن سے مل کر میرا جی خوش ہوا۔ چند روز کے بعد وہ لاہور واپس چلے گئے۔ خواجہ صاحب نہایت سنجیدہ انسان تھے، لیکن ان سے میری تھوڑی سی بے تکلفی تھی۔ اس لئے میں اس قسم کی دلچسپ باتیں اُن سے کر لیتا تھا، ورنہ کسی اور کی مجال نہیں تھی کہ اُن سے اس طرح کی باتیں کرے۔
خواجہ صاحب بڑے ہی شفیق اُستاد اور انسان دوست آدمی تھے۔ اپنے طالب علموں کی ہمیشہ مدد کرتے تھے۔ اُنہیں بڑی محنت سے پڑھاتے تھے۔ اُن کی خدمت کو اپنا فرض اولین جانتے تھے۔ طالب علم تعلیم سے فارغ ہوجاتے تھے تو ملازمت دلوانے میں بھی ہمیشہ اُن کی مدد کرتے تھے۔ خوف خدا اُن میں بہت تھا، اور وہ ایک دین دار اور صوم وصلوٰۃ کے پابند انسان تھے۔ اُن کے طالب علم اور عملے کے لوگ اُن کی پرستش کرتے تھے۔

اُن کی انسان دوستی کا ایک واقعہ مجھے آج تک یاد ہے۔

یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کی لائبریریوں کے لئے اسسٹنٹ لائبریرینز کے تقرر کے لئے جو کمیٹی تشکیل دی گئی تھی خواجہ صاحب اس کے صدر تھے، اور میں اس کا ایک ممبر تھا۔

میں نے اورینٹل کالج کی لائبریری میں عارضی طور پر ایک شخص کا تقرر کر لیا تھا۔ اس کے پاس لائبریری سائنس کا ڈپلومہ تھا۔ لیکن وہ خاصا نروس آدمی تھا۔ جب وہ مستقل ملازمت کے لئے اس کمیٹی کے سامنے انٹرویو کے لئے پیش ہوا تو کچھ گھبرایا ہوا سا تھا۔ خواجہ صاحب نے لائبریری کے بارے میں اُس سے کئی سوال پوچھے لیکن وہ ایک کا بھی جواب نہ دے سکا۔

یہ صورت حال دیکھ کر میں بھی کچھ پریشان سا ہوا۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اُس کی حمایت میں کچھ کہوں، خواجہ صاحب خود مجھ سے مخاطب ہوئے اور بولے کہ "یہ امیدوار ہم لوگوں کے سامنے کچھ گھبرا گیا تھا لیکن اس کے پاس ڈپلومہ ہے۔ سال بھر سے یہ اورینٹل کالج میں کام بھی کر رہا ہے۔ پرنسپل کی رپورٹ بھی اس کے حق میں ہے۔ اس کے حالات بھی کچھ اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ اس لئے اس کا تقرر کر لینا چاہیئے۔"

میں چُپ رہا۔ خواجہ صاحب نے مجھے موقع ہی نہیں دیا کہ میں کچھ بولوں۔ انہیں معلوم تھا کہ میں اس کی حمایت کروں گا۔ اس لئے میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی انہوں نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا، اور اُس امیدوار کی اس طرح مدد کر کے اپنی انسان دوستی کا حق ادا کر دیا۔

خواجہ صاحب کی معاملہ فہمی اور دوست نوازی بھی اس واقعے سے صاف ظاہر ہے۔

میں نے تقریباً تیس سال خواجہ صاحب کی رفاقت میں گذارے، اور اُن کی شفقت، محبت اور معاملہ فہمی کے ایسے ایسے پہلو اُن کی شخصیت میں دیکھے

جو آج بھی میرے لئے مسرت اور طمانیت کا باعث ہیں، کیونکہ میں بھی خواجہ صاحب کے نقش قدم پر چلنے کو اپنے لئے ایک سعادت سمجھتا ہوں۔ اُن کے انتقال کو کئی سال ہو گئے ہیں۔ لیکن اُن کی باغ و بہار شخصیت کی دلکش یادیں آج بھی میرے دل میں چراغاں کا سا منظر پیش کر کے دھومیں سی مچاتی ہیں۔

خواجہ صاحب کے ایسے لوگ اب اس معاشرے میں خال خال ہی نظر آئیں گے۔

مولانا امتیاز علی خاں عرشی

مولانا امتیاز علی خاں عرشی اورنیٹل کالج کے نامور طالب علم تھے۔ اُنھوں نے بین الاقوامی شہرت کے اس تدریسی و تحقیقی ادارے میں عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی، اور علمی ادبی کام میں اس طرح ڈوبے کہ زندگی بھر پھر کوئی اور کام نہیں کیا۔ فارسی اور اُردو کی قدیم کتابوں کی انھوں نے اس طرح ترتیب و تدوین کی جس نے یورپ کے بڑے بڑے پروفیسروں اور محققوں کی یاد تازہ کردی۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ناظم کتب خانہ کی حیثیت سے مشہور زمانہ رضا لائبریری رام پور میں گذارا، اور ایسے ایسے علمی ادبی کارنامے انجام دیئے جو فارسی اور اُردو کی تحقیقی روایت میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ قدیم قلمی کتابوں کی متن شناسی میں اُنھیں ملکہ حاصل تھا، اور اس دیدہ ریزی کے کام میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

اپنی طالب علمی کے زمانے میں، غائبانہ طور پر میں عرشی صاحب سے بخوبی واقف تھا۔ میرے محترم اساتذہ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب، مولانا محمد حسین صاحب، پروفیسر سید احتشام حسین صاحب سے اکثر اُن کا اور اُن کے علمی کاموں کا ذکر رہتا تھا۔ میرے اِن اساتذہ کرام نے ہمیشہ عرشی صاحب کی

تعریف کی اور میرے ذہن میں یہ بات ڈالی کہ وہ ایک بہت بلند پایہ محقق اور ادبیات فارسی و اردو کے بہت بڑے مزاج داں ہیں۔

میں ۱۹۴۲ء لکھنؤ یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کرنے کے بعد پی ایچ ڈی کرنے کے لئے تقریباً چار پانچ سال مزید لکھنؤ یونیورسٹی میں رہا۔ اس زمانے میں عرشی صاحب کی کتابیں احمد علی یکتا کی دستور الفصاحت، مکاتیب غالب، نادرات شاہی، فرہنگ غالب، وقائع عالم شاہی، انتخاب غالب وغیرہ شائع ہو چکی تھیں اور میں نے ان کتابوں کا مطالعہ بڑے ذوق و شوق سے کیا تھا۔ یہ کتابیں میری معلومات میں اضافے کا باعث بنی تھیں، اور مجھے ان سے ترتیب و تدوین کے فن کے ساتھ آشنا ہونے کا موقع ملا تھا۔ بعد میں اُن کی کتابیں تاریخ محمدی، تاریخ اکبری، محاورات بیگم، رانی کیتکی کی کہانی، کتاب الاجناس اور دیوان غالب (نسخۂ عرشی) سے بھی میں نے استفادہ کیا۔ ان کتابوں نے عرشی صاحب کے علم و فضل، اور محبت و جفاکشی کی دھاک میرے دل میں بٹھا دی۔

اسی زمانے میں ایک دفعہ وہ لکھنؤ تشریف لائے، اور اُستاد محترم پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب صاحب کے توسط سے میری اُن سے سرسری سی ملاقات ہوئی۔ میں اس زمانے میں ایک معمولی سا طالب علم تھا لیکن جب میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ مجھ سے بڑی محبت اور شفقت سے ملے۔ خاصا وقت اُنہوں نے مجھے دیا، دیر تک مجھ سے باتیں کیں اور مجھے علمی ادبی کام کرنے کے سلسلے میں نہایت مفید مشورے دیئے۔

عرشی صاحب اُس زمانے میں جوان تھے۔ اُن کی عمر اس وقت چالیس پینتالیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ دراز قد، چوڑا کتابی چہرہ، چہرے پر سیاہ رنگ کی داڑھی، کھلتا ہوا گندمی رنگ، سر پر سیاہ رنگ کی مخمل کی رام پوری ٹوپی جسم پر سفید رنگ کی گھٹنوں سے نیچی شیروانی اور علی گڑھ کٹ کے پاجامے میں ملبوس، وہ مجھے بہت باقاعدہ، تیز طرار، زندگی اور جولانی سے بھرپور، لیکن تہذیب د

شائستگی کے زیور سے مالامال، خوش گفتار، صاف گو، بے باک، نڈر اور زندہ دل انسان نظر آئے۔

اس ملاقات میں اُردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کے ساتھ ساتھ بریلی، رام پور، اور روہیل کھنڈ کے پٹھانوں کے بارے میں بھی اُن سے باتیں ہوئیں، اس لئے کہ یہی ایک نسلی خصوصیت ہمارے درمیان مشترک تھی۔ اُن کی اِن باتوں سے میری معلومات میں گراں قدر اضافہ ہوا اور بہت لطف آیا۔

کہنے لگے "پٹھانوں کے مختلف قبیلوں نے ہندوستان میں سیاسی، تہذیبی اور علمی ادبی اعتبار سے بڑے ہی اہم کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ان کارناموں کا تاریخی اور تنقیدی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اس موضوع پر کام کرنے کا ایک منصوبہ بھی میرے پیش نظر ہے۔ اگر زندگی رہی اور فرصت ملی تو میں یہ کام ضرور کروں گا۔"

میں نے کہا "واقعی یہ تو بڑا اہم کام ہے۔ ابھی تک اس موضوع کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ آپ یہ کام کردیں گے تو ہندوستان کی تاریخ میں گراں قدر اضافہ ہوگا۔"

عرشی صاحب کہنے لگے "میں رضا لائبریری رام پور میں کتابوں کی دیکھ بھال میں اور ترتیب و تدوین کے کام میں بہت مصروف رہتا ہوں۔ یہ بڑی ہی دیدہ ریزی، محنت اور جان فشانی کا کام ہے۔ لیکن میری دلچسپی بھی یہی ہے۔ میرا زیادہ وقت انہیں کاموں میں گذرتا ہے، اور یہ کام میں نے اورینٹل کالج لاہور کے دورانِ قیام میں سیکھا ہے۔ میں اس اہم تحقیقی اور تدریسی ادارے کے ساتھ بہ حیثیت طالب علم کئی سال تک منسلک رہا ہوں اور اس ادارے کے نامور اساتذہ نے میرے دل میں اس قسم کے کام کرنے کی شمعیں فروزاں کی ہیں۔ میں اورینٹل کالج کی تحقیقی روایت کا ایک ادنیٰ سا علم بردار ہوں۔ اس اعتبار سے اس ادارے نے اہم علمی ادبی خدمات انجام دی ہیں۔"

غرض خاصی دیر تک اس طرح عرشی صاحب مجھ سے باتیں کرتے رہے۔

وقت خاصا ہوگیا تھا۔ اس لئے میں نے اُن سے اجازت لی۔

چلتے وقت انہوں نے کہا "آپ ادب کے طالب علم ہیں۔ کبھی ہماری لائبریری سے کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بے تکلفی سے لکھئے، میں تعمیل کروں گا۔ ہو سکے تو کبھی رام پور بھی آئیے۔ آپ کو وہاں کام کرنے کی تمام سہولتیں فراہم کی جائیں گی"۔

میں ان کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے رخصت ہوا، اور یہ سوچتا رہا کہ عرشی صاحب بڑے ہی شفیق بزرگ ہیں اور علم و ادب اُن کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ وہ خود بھی کام کرتے ہیں، اور نوجوانوں کو بھی کام کرنے کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ وہ واقعی عظیم شخصیت کے مالک ہیں۔

عرشی صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

اس کے بعد کئی سال تک میری اُن سے ملاقات نہ ہو سکی۔ البتہ علمی کاموں کے سلسلے میں خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ اپنے ادبی کاموں کے سلسلے میں مجھے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی تھی، مولانا عرشی اُن کو بڑی شفقت اور محبت سے فراہم کر دیتے تھے۔ اُن کے توسط سے میں نے رضا لائبریری رام پور سے بہت استفادہ کیا۔

۱۹۴۵ء کے اوائل میں میں اردو کے اُستاد کی حیثیت سے دِلّی چلا گیا، اور اینگلو عربک کالج میں صدر شعبۂ اُردو کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔ قیام پاکستان تک دلّی میں میرا قیام رہا۔ اس زمانے میں بھی عرشی صاحب سے خط و کتابت جاری رہی۔ کبھی کبھی وہ ریڈیو پر تقریریں کرنے کے لئے دلّی آتے تھے تو اُن سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی، اور میں اپنے کاموں کے سلسلے میں اُن سے رہنمائی حاصل کرتا تھا۔ اس زمانے میں بھی اُن کی ذات میرے لئے روشنی کا ایک مینار رہی۔

قیام پاکستان کے بعد میں لاہور آگیا، اور اورینٹل کالج میں تدریس و تحقیق کا کام شروع کر دیا۔ مولانا عرشی میرے لاہور آنے اور اورینٹل کالج سے وابستہ ہونے پر بہت خوش ہوئے۔ اب انہوں نے میرے علمی کاموں کی تکمیل میں کچھ

زیادہ ہی شفقت اور محبت کا اظہار کیا۔ اس زمانے میں انھوں نے میری فرمائش پر اورینٹل کالج میگزین کے لئے مضامین بھی لکھے۔

۱۹۵۸ء میں تاشقند جاتے ہوئے اُنھوں نے چند روز لاہور میں قیام کیا اور اپنے کسی دوست کے ساتھ ٹھہرے۔ اورینٹل کالج میں بھی کئی بار تشریف لائے۔ اساتذہ اور طلبا سے خطاب بھی کیا، اور کئی دفعہ مجھے مفصل ملاقات کا موقع بھی دیا۔ اپنے کاموں کی تفصیل بیان کی اور میرے کاموں کی تفصیل بھی دریافت کی۔ اس طرح اُن کی صحبت میں چند روز بہت اچھے گذرے۔ انھیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع مِلا، اور مختلف موضوعات پر کئی کئی گھنٹے اُن سے باتیں ہوئیں۔

اُن کے اس سفر کے متعلق میں نے اُن سے پوچھا "آپ تاشقند کس سلسلے میں جا رہے ہیں؟"

کہنے لگے "ہندوستان سے دو تین لکھنے والوں کا ایک وفد تاشقند جا رہا ہے۔ اس وفد کا ایک ممبر میں بھی ہوں۔ میں سوویٹ یونین کی مسلمان ریاستوں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اُن کی تاریخ و تہذیب اور ادب و شعر کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔ دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں سے مِلنا چاہتا ہوں۔ اسی خیال سے اس وفد میں شامل ہو گیا ہوں۔ دوسرے ممبر تو ایک ہفتے بعد تاشقند پہنچیں گے۔ میں نے یہ سوچا کہ میں رام پور سے چند روز پہلے نکلوں، چند روز میں لاہور میں قیام کر لوں۔ پرانے دوستوں سے مِل لوں، اور لاہور کو ایک دفعہ پھر دیکھ لوں۔ اسی خیال سے چند روز کے لئے یہاں آیا ہوں۔"

میں نے کہا "لاہور تو آپ کا شہر ہے۔ آپ نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں کئی سال اس شہر گل رُخاں میں گذارے ہیں۔ آپ کو کبھی کبھی یہاں ضرور آنا چاہئیے۔ ہم لوگوں کی خوش قسمتی ہے کہ آپ نے اس شہر میں چند روز قیام کے لئے وقت نکالا۔"

کہنے لگے "لاہور مجھے بہت پسند ہے۔ میں اس شہر کے حُسن و جمال کا دلدادہ ہوں۔ اس کے علمی ادبی ماحول کا والا و شیدا ہوں۔ آج بھی اس شہر کے لوگ مجھ سے بڑی

محبت سے ملتے ہیں یہاں آکر میرا جی خوش ہوتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اب آپ اس شہر بے مثال میں ہیں اور اورینٹل کالج کے ساتھ منسلک ہیں۔ یہاں علمی کام کرنے کا نہایت خوشگوار ماحول ہے۔ اس سے فائدہ اٹھائیے۔ میں نے بھی اس ماحول سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔"

غرض کئی ملاقاتوں میں ہم لوگ آپس میں اس قسم کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے اُن کی اِن صحبتوں سے بہت کچھ حاصل کیا۔ چند روز بہت اچھے گذرے۔

اُس زمانے میں مشہور مصور شاکر علی صاحب یورپ سے لاہور آگئے تھے اور اُنھوں نے نیشنل کالج آف آرٹس کے پرنسپل کا عہدہ سنبھال لیا تھا۔ وہ رام پور کے رہنے والے تھے، اور عرشی صاحب سے اُن کی دوستی تھی۔

شاکر علی صاحب کو عرشی صاحب کے لاہور آنے کی خبر ملی تو ایک روز انھوں نے اُن کے اعزاز میں اپنی جائے قیام پر بڑے پُرتکلف ظہرانے کا اہتمام کیا۔ چند بے تکلف احباب اس میں شریک ہوئے۔ مجھے بھی بُلایا۔ میں نے بھی شرکت کی۔

عرشی صاحب اس موقع پر نہایت شاداں و فرحاں نظر آئے۔ اُن کی علمیت، متانت اور سنجیدگی کے بند ٹوٹ گئے اور کھانے کے دوران، اور اس کے بعد بذلہ سنجی کے ساتھ اُنھوں نے ایسی باتیں کہیں اور ایسے ایسے فقرے تراشے کہ ساری محفل کو زعفران زار بنا دیا۔

کھانے کی میز پر عرشی صاحب میرے برابر بیٹھے۔ قسم قسم کے لذیذ کھانے ہمارے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ مُرغ کا سالن، بریانی، کوفتے، اسٹو اور خدا جانے کیا کیا۔ اِن قسم قسم کے کھانوں کے ساتھ شاکر صاحب نے رام پور کے پٹھانوں کی خاص ڈش گائے کے گوشت کے "ڈکّر" کی بھی تیار کروائی تھی۔ اس کا ڈونگہ کچھ دور پر رکھا ہوا تھا۔ عرشی صاحب اس کی طرف کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھتے رہے۔

کھانا شروع ہوا تو اُنھوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "عبادت صاحب! ہاتھ بڑھائیے اور "ڈکّر" ادھر اُٹھائیے۔ کھانے تو یہاں سب ہی لذیذ ہیں، لیکن

زیادہ تر ذرا چھوٹے جانوروں کے گوشت سے تیار کئے گئے ہیں۔ ڈکر بڑے جانور کا گوشت ہے۔ اس لئے میں اس سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔ یہ روہیل کھنڈ کے پٹھانوں کا صحیح کھانا ہے"۔

عرشی صاحب کی یہ دلچسپ بات سُن کر سب لوگ ہنسنے لگے بلکہ قہقہے لگانے کے لئے مجبور ہو گئے۔

میں نے کہا "عرشی صاحب! آج تو آپ نے اپنے پٹھان ہونے کا ثبوت دے ہی دیا"۔

کہنے لگے "پٹھان ہر حال میں پٹھان ہوتا ہے۔ وہ خود بھی بڑا ہوتا ہے، اور بڑی چیزوں کو پسند کرتا ہے۔ گوشت بھی بڑے جانور کا کھاتا ہے۔ بڑے جانور کے گوشت میں جو مزہ ہے وہ چھوٹے جانور کے گوشت میں نہیں ہے"۔

غرض کھانے کے دوران دیر تک وہ اس طرح کی دلچسپ باتیں کرتے رہے۔ اور اُن کی گل افشانیٔ گفتار سے کھانے کی یہ محفل زعفران زار بنی رہی۔ شاکر علی صاحب اور دوسرے احباب اُن کی باتوں سے خوب لطف اندوز ہوئے۔

دوسرے دن عرشی صاحب لاہور سے تاشقند روانہ ہو گئے، اور یہ کہہ کر ہم لوگوں سے رخصت ہوئے کہ "تاشقند سے واپسی پر میں انشاءاللہ پھر لاہور رُکتا ہوا دِلّی جاؤں گا۔ دو تین دن ٹھہروں گا آپ حضرات سے انشاءاللہ ایک بار پھر ملاقات ہوگی"۔

دو ہفتے کے بعد عرشی صاحب تاشقند سے واپس آئے۔ لاہور میں تین چار دن قیام کیا۔ احباب سے ملاقاتیں کیں۔

ایک ملاقات میں میں نے اُن سے تاشقند اور روس کی دوسری مسلمان ریاستوں کے بارے میں یہ دریافت کیا کہ "مسلمانوں کا وہاں کیا حال ہے؟"

عرشی صاحب نے بڑی حسرت سے وہاں کے مسلمانوں کی حالت بیان کی اور کہا "اُن علاقوں میں تقریباً سو فی صد مسلمان آباد ہیں۔ پرانے بزرگ ابھی تک

اسلام کے شیدائی ہیں۔ البتہ نئی نسل میں مذہب کا چرچا ذرا کم ہے۔ مسجدیں کھلی ہوئی ہیں۔ بزرگ ان میں نماز پڑھنے بھی جاتے ہیں لیکن اُن کے مذہب کی بات کی جائے تو کتراتے ہیں۔ اور مسلمان کی حیثیت سے بات کرتے ہوئے کچھ گھبراتے ہیں۔ کیونکہ مذہبی بحث مباحثے پر روس میں ابھی تک پابندی ہے۔ میں نے ایک بزرگ سے اس موضوع پر بات کی تو اُن کی آنکھوں میں آنسو آگئے لیکن زبان بندی کی وجہ سے کچھ کہہ نہ سکے۔"

یہ بات جب عرشی صاحب کی زبان پر آئی تو اُن پر رقت طاری ہو گئی۔ اور اور پھر میں نے دیکھا کہ اُن کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

عرشی صاحب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "کتنے افسوس کی بات ہے کہ وہ علاقے جو کبھی ہماری تہذیب و سیاست اور فکر و فلسفہ کے مرکز تھے وہاں لوگ اب دین کی بات کرتے ہوئے گھبراتے ہیں اور صرف نام کے مسلمان ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ روس کی حکومت نے اُن کی تہذیب و کلچر پر ڈاکہ نہیں ڈالا ہے۔ اس پر شب خون نہیں مارا ہے۔ مادی زندگی کی ترقی اور سائنس ٹیکنالوجی کی نئی دریافتوں نے اُن کی زندگیوں کو انقلاب سے ہم کنار کیا ہے۔ اور وہ ارتقاء کے راستے پر گامزن ہیں۔ علم و ادب کا اِن علاقوں میں ایسا صحت مندانہ ماحول ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ لوگ لکھنے پڑھنے کے شوقین ہیں۔ کتابیں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوتی ہیں، اور چھوٹے بڑے سب نہایت شوق و انہماک سے اُن کا مطالعہ کرتے ہیں۔"

غرض لاہور میں دو تین دن تک اس قسم کی باتیں کر کے عرشی صاحب دِلّی روانہ ہو گئے اور اِن کی دلچسپ باتیں ہمارے دلوں میں خاصے عرصے تک دھومیں مچاتی اور چراغ سے روشن کرتی رہیں۔

رام پور پہنچ کر اُنھوں نے فرداً فرداً لاہور کے تمام احباب کو خط لکھے، اور

ان خطوں میں اُن کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا، اور لاہور کے علمی ادبی ماحول کو بڑی محبت سے یاد کیا۔ بعضوں کو تو انہوں نے یہ بھی لکھا کہ کاش وہ لاہور میں مستقل طور پر قیام کر سکتے!

عرشی صاحب سے میری آخری ملاقات ۱۹۷۷ء میں علامہ اقبالؒ کے جشن صد سالہ کے موقع پر دِلّی میں ہوئی۔ میں پاکستانی وفد کے ایک ممبر کی حیثیت سے جشن اقبالؒ میں شرکت کے لئے دِلّی گیا تھا۔ اس کانفرنس کے اجلاس کئی دن تک وگیان بھون میں ہوتے رہے۔ اطلاع یہ ملی تھی کہ مندوبین میں عرشی صاحب بھی شامل ہیں، لیکن وہ کسی اجلاس میں تشریف نہیں لائے۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ ہیں تو دِلّی میں لیکن ناسازیٔ طبع کے باعث اجلاسوں میں شریک نہ ہو سکے۔ میں نے اُن کا پتہ پوچھا۔ معلوم ہوا کہ سورج نگر یا راجندر نگر میں کسی عزیز کے ہاں اُن کا قیام ہے۔ ایک صاحب کو اُن کی جائے قیام کا علم تھا۔ وہ ہمیں اپنی گاڑی میں وہاں لے گئے۔ بڑی تلاش کے بعد اُن کا مکان مِلا۔ ہم لوگوں نے اطلاع کروائی۔ تھوڑی دیر کے بعد عرشی صاحب باہر تشریف لے آئے۔ بڑی محبت سے ملے۔

میں نے پوچھا آپ کی صحت کیسی ہے؟

کہنے لگے "میں خاصے عرصے سے علیل ہوں۔ خیال تھا طبیعت ذرا سنبھل جائے گی تو جشن اقبالؒ کے جلسوں میں شرکت کروں گا لیکن طبیعت خراب رہی۔ اس لئے شریک نہ ہو سکا"۔

میں نے کہا "اس عمر میں تو یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ انشاءاللہ آپ جلد ٹھیک ہو جائیں گے"۔

کہنے لگے "میں کئی سال سے بیمار ہوں۔ کئی تکلیفیں ہیں۔ علاج ہو رہا ہے۔ دیکھئے کب تندرست ہوتا ہوں"۔

میں نے کہا "آپ کے بغیر جلسے کچھ سونے سونے سے لگے۔ پاکستان سے آنے والے احباب آپ سے مِلنے کے مشتاق تھے"۔

عرشی صاحب نے کہا مَیں خود تمام احباب سے ملنے کا مشتاق تھا لیکن صحت نے اجازت نہ دی، افسوس رہا۔

میں نے اس مُلاقات میں محسوس کیا کہ وہ واقعی بہت بیمار ہیں۔ اُن کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ کمزور بہت تھے۔ چلنے کے لئے سہارا لینا پڑتا تھا۔ یقیناً وہ کسی مہلک بیماری میں مبتلا تھے۔

کوئی ایک گھنٹہ ہم نے اُن کے ساتھ گذارا۔ نقاہت کے باوجود اُنہوں نے ہم سے دلچسپ باتیں کیں۔ رضا لائبریری کا حال اُنہوں نے بیان کیا۔ اپنے علمی کاموں کے منصوبوں کی تفصیل سُنائی۔ پاکستان کے احباب کا حال احوال دریافت کیا۔

غرض خاصی دیر تک یہ باتیں کر کے ہم نے ان سے اجازت لی۔ اپنی علالت اور نقاہت کے باوجود وہ ہمیں باہر تک رخصت کرنے کے لئے آئے۔ ہم نے منع بھی کیا لیکن وہ نہیں مانے۔ اُن کی تہذیب و شائستگی نے اس کو گوارا نہیں کیا کہ ہم لوگوں کو اندر ہی سے رُخصت کر دیں۔

یہ عرشی صاحب سے میری آخری ملاقات تھی۔ اس ملاقات کے تقریباً تین سال بعد ۱۹۸۱ء میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

عرشی صاحب بڑے ہی مہذب اور شائستہ انسان تھے۔ اُن کی زندگی محبت اور خدمت سے عبارت تھی۔ وہ اپنے چھوٹوں تک کا احترام کرتے تھے اور اُن کی خدمت کو اپنا نصب العین سمجھتے تھے۔ علمی کام کرنے والوں کی اُن کے دِل میں بڑی عزت تھی۔ وہ ہر حال میں اُن کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور اُن کے علمی کام کو دیکھ کر انہیں بڑی مسرت ہوتی تھی۔ دراصل وہ چاہتے یہ تھے کہ جو روایت اُنہوں نے علم و ادب کی دُنیا میں قائم کی، وہ نوجوانوں کے ہاتھوں پروان چڑھے اور آگے بڑھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے بے شمار نوجوانوں کے علمی کاموں کی آبیاری کی اور انہیں بلندیوں سے ہم کنار کیا، اور یہ اُن کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

عام طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ بڑے عالم اور محقق، جہاں تک علمی معاملات کا تعلق

ہے ،طبعاً بخیل ہوتے ہیں ،اور نوجوانوں کی حوصلہ افزائی اور مدد سے پہلو تہی کرتے ہیں اور اس طرح نوجوان نسل اُن سے بد دل ہو جاتی ہے ۔عرشی صاحب میں یہ بات نہیں تھی ۔اُنھوں نے اپنے دروازے نئی نسل کے لئے کُھلے رکھے تھے ۔یہی وجہ ہے کہ اس نسل کے بے شمار لوگوں نے اُن سے مختلف طریقوں سے استفادہ کیا ۔اور علم و تحقیق کی دنیا میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے ۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ عرشی صاحب کے مزاج میں بڑی ہی عاجزی اور انکساری تھی ۔انہیں اپنی بڑائی کا احساس نہیں تھا ۔تحقیق کا جو کام وہ کرتے تھے ، وہ اُن کے نزدیک حرفِ آخر نہیں تھا ۔اگر کوئی اس میں اضافہ کرے یا اُن سے اختلاف کرے تو وہ اس کو نہایت خندہ پیشانی سے قبول کرتے تھے ۔کبھی اس سے ناراض نہیں ہوتے تھے ،برخلاف اس کے اس کو سراہتے تھے ۔

اسی سلسلے میں ایک واقعہ مجھے کبھی نہیں بھولتا ۔

میسور میں ایک خاتون ڈاکٹر آمنہ خاتون تھیں جن کا مزاج تحقیقی تھا ،اور وہ اعلےٰ درجے کے تحقیقی مضامین لکھتی تھیں ۔اُن کے مقالات کا ایک مجموعہ "تحقیقی نوادر" کے نام سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہو چکا ہے ۔

جب عرشی صاحب نے ۱۹۴۳ء میں احمد علی یکتا کی کتاب دستورالفصاحت کو مُرتب کر کے شائع کیا تو آمنہ خاتون صاحبہ نے اس پر ایک تبصرہ لکھا ۔اور اس میں اُن کی کچھ غلطیوں کی نشان دہی کی ۔یہ تبصرہ انہوں نے عرشی صاحب کو بھیج دیا ۔عرشی صاحب بجائے اس کے کہ اس کو محسوس کرتے اور بُرا مانتے ، اُنہوں نے خود اس کو رسالہ بُرہان میں شائع کروا دیا ،اور آمنہ صاحبہ کو خط لکھا جس میں اُن کا شکریہ ادا کیا ۔اور نہ صرف یہ بلکہ جب وہ اپنے علمی کاموں کے سلسلے میں رام پور گئیں ،تو اُنہوں نے اُن کو اور اُن کے شوہر محمد خاں صاحب

کو اپنے ہاں مہمان رکھا۔ اور رام پور کے دوران قیام میں اُن کی ہر طرح خدمت کی۔ رضا لائبریری کے دروازے بھی اُن کے لئے کھول دیئے۔ یہ سب کچھ عرشی صاحب کی اعلیٰ ظرفی ہی کر سکتی تھی۔

اس دورِ پر آشوب میں تو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی ایسے لوگ نہیں ملیں گے!

مولانا سیّد مُرتضیٰ حُسین فاضل

میرے اُستاد محترم پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب لکھنؤ یونیورسٹی میں فارسی اور اُردو کے پروفیسر تھے۔ اُن کا زیادہ وقت لکھنے پڑھنے اور ادبی تحقیق کے کاموں میں صرف ہوتا تھا۔ اُن کا ذاتی کتب خانہ ایسا تھا کہ دُور دُور سے اہلِ علم آکر اُس سے استفادہ کرتے تھے۔ اس کتب خانے میں بے شمار نادر و نایاب مطبوعہ کتابیں تھیں، اور خاصی تعداد میں قلمی نسخے بھی ایسے تھے جو یورپ اور انگلستان کے کتب خانوں کی یاد دلاتے تھے۔

پروفیسر صاحب کو یہ کتابیں بہت عزیز تھیں لیکن اُنہوں نے اپنے اس کتب خانے کے دروازے اہلِ علم کے لئے کھول رکھے تھے۔ ادب کے سنجیدہ طالب علموں کو اگر کسی کتاب کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ پروفیسر صاحب کے ہاں جا کر اُس سے استفادہ کرسکتا تھا۔ وہ اِن کتابوں کو دکھانے میں بُخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ شرط یہ تھی کہ طالب علم علمی کام کرنے کا مزاج رکھتا ہو، اور کتاب کو احتیاط سے استعمال کرے۔

طالب علمی کے زمانے میں میرا یہ معمول تھا کہ میں اتوار کو صبح کے وقت اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ اِطلاع ملتے ہی پروفیسر صاحب باہر تشریف

لے آتے تھے۔ میرا حال احوال پوچھتے اور مجھ سے دیر تک باتیں کرتے تھے۔
ان کی باتوں سے میری معلومات میں اضافہ ہوتا تھا۔ اور اُن کی گل افشانیٔ
گفتار مجھے مسحور کر دیتی تھی۔ کبھی کسی کتاب کی ضرورت ہوتی تھی تو پروفیسر صاحب
وہ کتاب بھی نکلوا دیتے تھے۔ دوپہر تک میں اُن کے کتب خانے میں کام کرتا تھا۔
دوسرے لوگ بھی دور دور سے اُن کے ہاں اسی طرح آتے تھے۔

ایک دن میں پروفیسر صاحب کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک صاحب تشریف
لائے جو لکھنؤ کی وضع قطع کا نمونہ تھے۔ سر پر اودھ کی کشتی نما ٹوپی، گھٹنوں سے
نیچی شیروانی۔ بڑے پائنچوں کا پاجامہ، چہرے پر خشخشی ڈاڑھی۔ گندمی رنگ۔
چھریرا بدن ــــ نہایت نستعلیق انداز میں آداب و تسلیمات بجا لائے، اور
نہایت ادب و احترام کے ساتھ پروفیسر صاحب کے پاس آکر بیٹھ گئے۔

یہ مولانا سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی تھے!

مسعود صاحب کی گل افشانیٔ گفتار کا سلسلہ جاری رہا۔ اور ہم دونوں چپ
چاپ اُن کی دلکش و دل آویز باتوں کی ساحری سے محظوظ ہوتے رہے۔

تھوڑی دیر میں پروفیسر صاحب کسی کام سے اندر گئے تو میں نے مولانا
سے کہا "جناب کا تعارف نہ ہو سکا۔ میری بدقسمتی ہے کہ لکھنؤ میں رہتے ہوئے
بھی اس سے قبل جناب والا سے مُلاقات نہ ہو سکی"۔

مولانا کہنے لگے "خاکسار کو مرتضیٰ حسین کہتے ہیں۔ سلطان المدارس میں پڑھتا
ہوں۔ وہ ایک دینی درس گاہ ہے۔ مجھے ادب و شعر سے بھی دلچسپی ہے۔ اسی
لئے کبھی کبھی مسعود حسن صاحب کی خدمت میں علمی استفادے کی غرض سے حاضر
ہوتا رہتا ہوں"۔

میں نے کہا "میں پروفیسر صاحب کا شاگرد ہوں۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھتا
ہوں۔ میرا نام عبادت ہے۔ پروفیسر صاحب مجھ پر شفقت فرماتے ہیں۔ اتوار
کو بھی مجھے اُن کے دولت خانے پر حاضر ہونے کی اجازت ہے۔ علمی استفادے کے

نے میں بھی حاضر ہوتا ہوں۔ اور پروفیسر صاحب کا قیمتی وقت ضائع کرتا ہوں
لیکن کیا کروں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔"

یہ مولانا مرتضیٰ حسین فاضل سے میری پہلی ملاقات تھی۔

جب تک پروفیسر صاحب باہر تشریف نہیں لائے۔ میں مولانا سے باتیں کرتا رہا۔ اُن کے نستعلیق انداز، ادب سے دلچسپی اور لہجے کی شیرینی نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس لئے اس پہلی ہی مُلاقات میں اُن سے میری دوستی ہوگئی۔

اور پھر کبھی مسعود صاحب کے ہاں، کبھی سلطان المدارس میں، اور کبھی مدرسۃ الواعظین میں اُن سے میری مُلاقاتیں ہوتی رہیں۔ لکھنؤ میں سلطان المدارس میرے مکان کے بالکل سامنے تھا، اور میں جب بھی چوک، گول دروازے، حضرت مخدوم شاہ میناؒ کی درگاہ یا میڈیکل کالج جاتا تھا تو سلطان المدارس کے درمیان سے گذر کر جایا کرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سلطان المدارس میں اچھا خاصا سبزہ زار تھا۔ اس میں کروندے کے درخت بہت خوبصورت تھے۔ اس میں سے گذر کر جانے سے طبیعت بحال ہو جاتی تھی۔ دوسرے یہ شارٹ کٹ بھی تھا۔ مدرسۃ الواعظین میں میرے ایک کلاس فیلو، اور کئی جاننے والے رہتے تھے — اور میں اکثر اُن کے پاس بھی جاتا تھا۔ یہاں بھی مولانا سے اکثر میری ملاقات ہو جاتی تھی۔

یہ مُلاقاتیں اس اعتبار سے بہت مفید ثابت ہوئیں کہ ان سے میری معلومات میں اضافہ ہوا، اور مجھ پر یہ حقیقت روشن ہوئی کہ مولانا الٰہیات اور مذہب ہی کے طالب علم نہیں ہیں، ادبیات سے بھی انہیں گہری دلچسپی ہے۔ بلکہ ایسا ہوا کہ جب بھی اُن سے ملاقات ہوئی تو زیادہ باتیں فارسی اور اُردو ادب کے بارے میں ہوئیں۔ یہ اُن کی طالب علمی کا زمانہ تھا، اور وہ الٰہیات کے طالب علم تھے لیکن میں نے ہمیشہ اُن سے باتیں کر کے یہ محسوس کیا کہ وہ ادب پر گہری نگاہ رکھتے ہیں اور ادبی تحقیق کے معاملات و مسائل سے پوری طرح آشنا ہیں۔ اس زمانے میں انہیں فارسی اور اُردو کے بے شمار اشعار یاد تھے، اور وہ ان اشعار

کو بر محل پڑھ کر ادب کے شیدائیوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ اُن کا ادبی ذوق بہت ستھرا اور نکھرا ہوا تھا، اور وہ ادبی مسائل پر اپنے مخصوص شیریں لہجے میں بات کر کے شہد و شکر کے دریا بہاتے تھے۔

غالب کی شخصیت اور شاعری نے اس زمانے میں انہیں خاص طور پر متاثر کیا، اور اس عظیم شاعر پر اُن کی تحقیق کا آغاز اسی زمانے سے ہوا۔ غالب کی فارسی اور اُردو شاعری، اُن کی نثری تحریروں، خصوصاً اُن کے خطوط کا اُنہوں نے تحقیقی زاویۂ نظر سے مطالعہ شروع کیا۔ مسعود صاحب کے ہاں ان موضوعات پر اُن کی گفتگو کئی بار سُنی اور میں اس سے متاثر ہوا۔

مسعود صاحب کو بھی غالب سے دلچسپی تھی۔ متفرقات غالب، انہوں نے اسی زمانے میں شائع کی تھی۔ میں نے اُن کو بھی یہ کہتے ہوئے سنا کہ "مرتضیٰ حسین صاحب غالب شناس ہیں، اور اگر حالات سازگار رہے تو غالب کے بارے میں اہم تحقیقی اور تنقیدی کام کریں گے"۔ مسعود صاحب ادب کے معاملات میں کسی کی رو رعایت نہیں کرتے تھے۔ تعریف مشکل سے کرتے تھے۔ لیکن میں نے اُن کی زبانی مولانا کے بارے میں یہ تعریفی کلمات سُنے۔ حالانکہ اس وقت مولانا کا سن ایسا کچھ زیادہ نہیں تھا، اور اُن کی کوئی خاص ادبی تحریریں بھی شائع نہیں ہوئی تھیں۔

مولانا قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان آگئے، وہ اپنی تہذیب اور اپنی معاشرت کو بھی ساتھ لائے۔ یہاں وہ تقریباً چالیس سال رہے لیکن یہاں اُن کا انداز نہیں بدلا۔ وہ جب بھی نظر آتے تھے، اپنے اسی پُرانے لباس میں نظر آتے تھے۔ اُن کے اندازِ گفتگو اور لہجے میں بھی فرق نہیں آیا۔ اُن کے رہن سہن کے طور طریقے بھی نہیں بدلے۔ اُن کی وضع داری میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اُن کے ملنے جُلنے کے آداب بھی نئے ماحول سے متاثر نہیں ہوئے۔ اس لئے کہ ایک مخصوص تہذیبی روایت کا رنگ اُن کی شخصیت میں کچھ اس طرح رچا ہوا تھا کہ اِن دونوں کو ایک

دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ ایک عظیم تہذیبی روایت کے علم بردار تھے، اور یہی تہذیبی روایت اُن کی شخصیت کی شناخت تھی۔

مولانا کی وضع داری کا یہ عالم تھا کہ لاہور میں ہر اتوار کو پہلے میرے غریب خانے پر تشریف لاتے تھے، اور کوئی ایک گھنٹہ مجھے اپنی دلکش و دلآویز شخصیت سے لُطف اندوز کرکے دوسرے احباب کے پاس چلے جاتے تھے۔ خصوصاً اس زمانے میں وہ پروفیسر سیّد وزیرالحسن عابدی صاحب کے بہت قریب تھے، کیونکہ دونوں کا مزاج علمی تھا، اور دونوں میں وہ تہذیبی روایت مشترک تھی جس کو مولانا بہت عزیز رکھتے تھے۔ دونوں ادب و شعر کے پرستار تھے، اور غالب کی شخصیت اور شاعری پر نئے زاویوں سے تحقیق و تنقید دونوں کا خاص میدان تھا۔ عابدی صاحب مرحوم غالب کے سب سے بڑے محقق اور نقاد تھے۔ اس اعتبار سے مولانا کے دل میں اُن کی بڑی عزت تھی اور وہ اُن سے علمی استفادہ بھی کرتے تھے۔

پاکستان میں مولانا کی شخصیت کے جوہر کھلے، اور اُنھوں نے لاہور کی خیال انگیز سرزمین میں رہ کر غالب اور بعض دوسرے شعراء پر قابل قدر کام کیا۔ غالب کی سوانح پر انھوں نے اس زمانے میں نیا مواد جمع کیا۔ اُن کے خطوط کے مجموعے از سرِ نو مرتب کیے۔ آتش کے کلام کو بھی اُنھوں نے بڑی محنت سے مُرتب کیا، اور فارسی شعراء پر بھی قابل قدر کام کیا۔ اُن کی تصانیف بے شمار ہیں، اور ان میں سے بیشتر کو مجلس ترقی ادب لاہور نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اِن کی ان تصنیف کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو ادب سے کتنی دلچسپی تھی، اور وہ ادبی کام کتنی محنت، جفاکشی اور سلیقہ شعاری سے کرتے تھے۔

مولانا فاضل ایک عالم دین بھی تھے، اور انھوں نے مذہب اور الٰہیات کے مختلف پہلوؤں پر بھی خاصا وقیع کام کیا ہے۔ مذہبی موضوعات پر بھی اُن کی تصانیف کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے لیکن اُن کی رواداری کا یہ عالم تھا کہ اُنھوں نے کبھی کسی مذہبی موضوع پر مجھ سے بات نہیں کی۔ کیونکہ مذہبی

معاملات میں میرے خیالات کا انہیں بخوبی علم تھا۔

صرف ایک دن انہوں نے مذہبی معاملات میں اپنی شدت کا احساس دلایا، لیکن اس کی نوعیت بھی مذہبی سے کہیں زیادہ سیاسی، معاشرتی، اخلاقی اور جذباتی تھی۔

مولانا اکثر میری پرنسپلی کے زمانے میں اورینٹل کالج میں تشریف لاتے تھے، اور کالج کی علمی ادبی سرگرمیوں میں گہری دلچسپی لیتے تھے — اس طرح ہم لوگوں کو اُن سے علمی استفادے کا موقع ملتا تھا۔

آخری بار وہ انقلاب ایران کے بعد ایک دن ایک ایرانی مجتہد کے ساتھ میرے پاس کالج میں تشریف لائے۔ آج وہ مجتہدوں کا لباس زیب تن کیے ہوئے تھے — اور صحیح معنوں میں لکھنؤ کے جناب معلوم ہو رہے تھے۔ انہوں نے ایرانی مہمان کا تعارف کروایا، اور مجھے علامہ خمینی پر اپنی تالیف "قم سے قم تک" کا ایک نسخہ بھی عنایت فرمایا۔

میں نے شکریہ ادا کیا، اور یہ کہا کہ "معزز ایرانی مہمان کا تعارف اورینٹل کالج کے شعبۂ فارسی کے اساتذہ سے ہو جائے تو اچھا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں ان کو بُلا لوں"۔

یہ کہہ کر میں نے شعبۂ فارسی کے اساتذہ کو اپنے کمرے میں آنے کی زحمت دی۔ چند منٹ میں وہ سب آ گئے۔ میں نے ایرانی مہمان سے اُن کا تعارف کروایا۔ فارسی کے اساتذہ میں ایک خاتون بھی تھیں۔

مولانا ان کو دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اُٹھے، اور یہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئے کہ "ایران میں اسلامی انقلاب ہو چکا ہے میں خاتون کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتا"۔

اس پر مجھے ہنسی آ گئی، اور میں اُن کے اس بھولپن اور اندازِ محبوبی اور طرزِ دلربائی سے بہت لطف اندوز ہوا۔

وہ جب کمرے سے باہر نکلے تو میں اُن کے پیچھے دوڑا، اور کالج کے سبزہ زار

میں انہیں جا پکڑا۔

مولانا کے ساتھ تھوڑی سی جو بے تکلفی تھی، وہ اس وقت کام آئی ——— میں نے اُن سے خاتون کی موجودگی پر معذرت کی اور کہا "مولانا! علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا 'وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ' آپ اس حقیقت کو مانیں یا نہ مانیں لیکن ہے یہ حقیقت ——— لیکن آپ کے جذبات اور خصوصی نظریات کے احترام میں ہم نے خاتون کو وہاں سے ہٹا دیا ہے۔ اب آپ تشریف لایئے۔ ویسے وہ خاتون تو اپنی برخوردار ہے۔ اس کو ہم نے پردے کے پیچھے بھیج دیا ہے، بلکہ آپ سے اُس کا پردہ کروا دیا ہے۔ اب تو آپ کو شکایت نہیں ہونی چاہئے۔ کمرے میں واپس تشریف لے چلیئے۔ ایرانی مہمان اور فارسی کے اساتذہ آپ کے منتظر ہیں۔ ہم آپ کو اس طرح تو یہاں سے نہیں جانے دیں گے"۔ میری یہ باتیں سُن کر مولانا کچھ نادم ہوئے اور میرے ساتھ پرنسپل کے کمرے میں تشریف لے آئے جہاں ایرانی مہمان اور اورینٹل کالج کے فارسی کے اساتذہ ابھی تک اس واقعے سے لُطف اندوز ہو رہے تھے، اور دلچسپ باتوں کا سلسلہ جاری تھا۔

مولانا بھی ہمارے ساتھ اس دلچسپ گفتگو میں شریک رہے، اور دیر تک یہ محفل مولانا کی دلچسپ شخصیت کی بدولت زعفران زار بنی رہی۔ ایرانی مہمان اپنی عبا قبا میں ملبوس مسلسل سگریٹ کے کش لگاتے رہے اور بار بار مولانا کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھتے رہے۔ فارسی کے اساتذہ منہ چھپا کر ہنستے رہے۔

اور میں دیر تک اس دلکش و دل آویز فضا سے لُطف اندوز ہوتا رہا۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

کی

کتابیں

اقبالیات

۱۔ جشن نامہ اقبال (اردو) — شائع کردہ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

۲۔ جشن نامہ اقبال (انگریزی) — 〃

۳۔ اورینٹل کالج میگزین اقبال نمبر (اردو) — 〃

۴۔ اورینٹل کالج میگزین اقبال نمبر (انگریزی) — 〃

۵۔ اقبال کی اردو نثر — اقبال اکیڈمی، لاہور

۶۔ اقبال — احوال و افکار — مکتبہ عالیہ۔ لاہور

۷۔ جہانِ اقبال (ادبی سوانح) (زیر طبع) — ادارۂ ادب و تنقید، لاہور

۸۔ اقبال کی غزل 〃 — 〃

۹۔ منظوماتِ اقبال 〃 — 〃

۱۰۔ اقبال کا فن 〃 — 〃

ادبی دریافت (نادر قلمی نسخوں کی دریافت اور ترتیب و تدوین)

۱۱۔ شکنتلا، مولفہ مرزا کاظم علی جوان (مع مقدمہ) — اردو دنیا، کراچی

۱۲۔ ہفت گلشن، مولفہ مظہر علی خاں ولا 〃 — 〃

۱۳۔ مادھونل اور کام کندلا 〃 — 〃

۱۴۔ دیوان [illegible] 〃 〃 — ادارۂ ادب و تنقید، لاہور

۱۵۔ گلزار چمن مولفہ خلیل علی خاں اشک (مع مقدمہ)	ادارۂ ادب و تنقید، لاہور
۱۶۔ رسالہ کائنات ״ ״	״
۱۷۔ شکوہ فرنگ مولفہ آغا جو شرف ״	״
۱۸۔ چار گلشن، مولفہ بینی نرائن جہاں ״	״
۱۹۔ دیوان مبتلا، مولفہ عبید اللہ خاں مبتلا ״	״
۲۰۔ دیوان حیدری، مولفہ سید حیدر بخش حیدری ״	״
۲۱۔ مختصر کہانیاں ״ ״	״
۲۲۔ تذکرہ گلشن ہند ״ ״	״
۲۳۔ گلزار دانش (دفتر اول) ״ ״	״
۲۴۔ گلزار دانش (دفتر دوم) ״ ״	״
۲۵۔ [illegible]، مولفہ آنند رام مخلص مع مقدمہ و حواشی	״
۲۶۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی انگریزی نظمیں، مولفہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ	״
۲۷۔ نقلیات ہندی جلد اول و دوم ״	״
۲۸۔ افسانۂ عشق، مولفہ الٰہی بخش شوق اکبرآبادی مع مقدمہ	״
۲۹۔ سیاحت نامہ مولفہ نواب کریم خاں مع مقدمہ	״
۳۰۔ نالۂ درد، مولفہ حضرت خواجہ میر درد (اردو ترجمہ مع مقدمہ)	״
۳۱۔ نکات الشعرا، مولفہ میر تقی میر (مع مقدمہ و حواشی)	״
۳۲۔ دیوان فارسی، مولفہ حضرت خواجہ میر درد ״	״
۳۳۔ جشن نامہ اورینٹل کالج (جلد اول)	״
۳۴۔ جشن نامہ اورینٹل کالج (جلد دوم)	״
۳۵۔ خطوط عبدالحق بنام عبداللہ چغتائی (مع مقدمہ و حواشی)	״

تحقیق و تنقید

۳۶۔ اردو تنقید کا ارتقا:	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی

۳۷. روایت کی اہمیت	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی
۳۸. غزل اور مطالعہ غزل	″
۳۹. خطبات عبدالحق : مع مقدمہ	″
۴۰. مقدمات عبدالحق : مع مقدمہ	اردو مرکز لاہور
۴۱. انتخاب خطوط غالب ″	″
۴۲. تنقیدی زاویے (پہلا ایڈیشن)	مکتبہ اردو لاہور
(دوسرا ایڈیشن)	اردو مرکز لاہور
۴۳. تنقیدی تجربے	اردو دنیا کراچی
۴۴. مومن اور مطالعہ مومن	″
۴۵. جدید شاعری	″
۴۶. کلیات میر (مع مقدمہ)	″
۴۷. کلیات مومن ″	″
۴۸. شاعری اور شاعری کی تنقید	″
۴۹. سحرالبیان — ایک تنقیدی مطالعہ	اورینٹل کالج لاہور
۵۰. غالب اور مطالعہ غالب	رائٹرز اکیڈمی لاہور
۵۱. غالب کا فن	گلوب پبلشرز، لاہور
۵۲. اقبالؒ کی اردو نثر	اقبال اکیڈمی، لاہور
۵۳. اقبالؒ — احوال و افکار	مکتبہ عالیہ لاہور
۵۴. میر تقی میر (حیات اور شاعری)	ادارۂ ادب و تنقید، لاہور
۵۵. ولی اورنگ آبادی ″	″
۵۶. پاکستان کے تہذیبی مسائل	″
۵۷. حضرت خواجہ میر دردؒ	″
۵۸. ادب اور ادبی قدریں	″

ڈاکٹر عبادت کی نئی کتابیں

○

ترکی میں دو سال

ترکی کا سفرنامہ جو پاکستان کے برادر ملک ترکی کی تعلیمی، علمی، معاشرتی اور تہذیبی
زندگی کی تصویروں کا ایک حسین و دلآویز مرقع ہے۔ قیمت: چالیس روپے

○

دیارِ حبیبؐ میں چند روز

سعودی عرب کا سفرنامہ، جس میں عمرہ اور حج کی تفصیل ہے اور مکہ مکرمہ اور
مدینہ منورہ اور دوسرے مقدس مقامات کا حال جذب و شوق کے ساتھ لکھا گیا ہے۔
قیمت: پچاس روپے

○

یادِ عہدِ رفتہ

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے خود نوشت حالات اس میں گذشتہ نصف صدی
کے حالات کی تفصیل ہے۔ قیمت: ڈیڑھ سو روپے

○

آزادی کے سائے میں

قیامِ پاکستان کے وقت کی خوں چکاں داستان کی تفصیل
قیمت: ۷۵ روپے

○

اورینٹل کالج میں تیس سال اور "بلاکشانِ محبت"

ڈاکٹر عبادت بریلوی

بلاکشانِ محبّت

اِدارۂ ادبؔ و تنقِید ○ لاہور